رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۳۴۰

جنوری 1957

رجب ۱۳۷۶ ھ — جلد ۴۷ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے — قیمت فی پرچہ دس آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن

لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۷ | جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۷۶ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۵۷ء | عدد ۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر و پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی اشاعت میں صرف ایک انسانی کمزوری "نفسانیت" کے اثرات و نتائج پر گفتگو کی گئی تھی۔ اب ہم عیوب کے دوسرے بڑے بڑے خاندانوں کا جائزہ لے کر دیکھیں گے کہ یہ نفسِ انسانی کی کن کمزوریوں سے وجود میں آتے ہیں اور کس طرح اُس کام کو خراب کرتے ہیں جو انسانیت کی تعمیر و اصلاح کے لیے، خصوصاً اسلام کے دیے ہوئے اصول اور نقشہ کار پر کیا جائے۔

ان میں سے ایک پورا خاندانِ عیوب اُس کمزوری سے جنم لیتا ہے جس کے لیے موزوں ترین نام "مزاج کی بے اعتدالی" ہے۔ نفسانیت کے مقابلے میں یہ ایک معصوم نوعیت کی کمزوری ہے، کیونکہ اس میں کسی بدنیتی کسی بُرے جذبے، کسی ناپاک خواہش کا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن خرابی پیدا کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نفسانیت کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کے اثرات و نتائج اُتنے ہی خراب ہوتے ہیں جتنے نفسانیت کے اثرات و نتائج۔

مزاج کی بے اعتدالی کا فطری نتیجہ نظر و فکر کی بے اعتدالی اور عمل و سعی کی بے اعتدالی ہے، اور یہ چیز زندگی کے حقائق سے براہِ راست متصادم ہوتی ہے۔ انسانی زندگی بے شمار متضاد عناصر کی مصالحت اور بہت سے مختلف عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں انسان رہتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ انسانی افراد میں تو ہر ایک فرد فرداً بھی ایسا ہی بنا ہوا ہے، اور انسانوں کے ملنے سے جو اجتماعی ہیئت بنتی ہے اس کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اس زندگی میں کام کرنے کے لیے فکر و نظر کا ایسا توازن، اور سعی و عمل کا ایسا اعتدال درکار ہے جو مزاج و فطرت کے توازن و اعتدال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ حالات کے ہر پہلو پر نگاہ رکھی جائے۔ معاملات کے ہر رُخ کو دیکھا جائے۔ ضروریات کے ہر گوشے کو اس کا حق دیا جائے۔ فطرت کے

ہر تقاضے کو ملحوظ رکھا جائے۔ کمال درجے کا معیاری اعتدال چاہے نصیب نہ ہو، مگر یہاں کامیابی کے لیے بہرحال اعتدال ناگزیر ہے۔ جتنا بھی وہ معیار سے قریب ہوگا اتنا ہی مفید ہوگا، اور جس قدر وہ اس سے دور ہوگا اسی قدر زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہوکر نقصان کا موجب بنے گا۔ دنیا میں آج تک جتنا بھی فساد رونما ہوا ہے، اور آج رونما ہے، اسی وجہ سے ہے کہ غیر متوازن دماغوں نے انسانی مسائل کو یک رُخے پن کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے کی کوششیں کیں، ان کو حل کرنے کے لیے غیر متوازن اسکیمیں بنائیں، اور ان کو نافذ کرنے کے لیے غیر معتدل طریقے اختیار کیے۔ یہی بگاڑ کا اصل سبب ہے؛ اور بناؤ کا جو کچھ بھی کام ہو سکتا ہے۔ فکر و نظر کے توازن اور طریقِ عمل کے اعتدال ہی سے ہو سکتا ہے۔

یہ وصف خاص طور پر تعمیر و اصلاح کی اُس اسکیم کو نافذ کرنے کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے جو اسلام نے ہمیں دی ہے، کیونکہ وہ بجائے خود توازن و اعتدال کے انتہائی کمال کا نمونہ ہے۔ اُس کو کتابوں کے صفحات سے واقعات کی دنیا میں منتقل کرنے کے لیے تو خصوصیت کے ساتھ وہی کارفرما اور کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جن کی نظر اسلام کے نقشۂ تعمیر کی طرح متوازن اور جن کا مزاج اسلام کے مزاجِ اصلاح کی طرح معتدل ہو۔ افراط و تفریط میں مبتلا ہونے والے انتہا پسند لوگ اس کام کو بگاڑ تو سکتے ہیں، بنا نہیں سکتے۔

نتائج کے اعتبار سے بے اعتدالی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ بالعموم ناکامی کی موجب ہوتی ہے۔ نظامِ زندگی میں اصلاح و تغیر کی کوئی اسکیم بھی لے کر آپ اٹھیں، آپ کی کامیابی کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ خود اس کے برحق ہونے پر مطمئن ہوں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے معاشرے کے عام انسانوں کو اس کے صحیح، مفید اور قابلِ عمل ہونے پر مطمئن کریں، اور اپنی تحریک کو اس شکل میں لائیں اور ایسے طریقے سے چلائیں جس سے لوگوں کی امیدیں اور دلچسپیاں اس کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ بات صرف اسی تحریک کو نصیب ہو سکتی ہے جو نظر و فکر میں بھی متوازن ہو اور طریقِ عمل میں بھی متوازن۔ ایک انتہا پسندانہ اسکیم، جو انتہا پسندانہ طریقوں سے چلائی جائے، عام انسانوں میں اپنے لیے رغبت اور امید پیدا کرنے کے بجائے نفرت اور مایوسی پیدا کرتی ہے۔ قائل اور مطمئن کرنے کے بجائے معترض اور

غیر مطمئن بناتی ہے ۔ اور اس کی یہ صفت خود ہی اس کی قوتِ تبلیغ اور قوتِ نفوذ کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے کچھ انتہا پسند لوگ اکٹھے ہو بھی جائیں تو سارے معاشرے کو اپنے جیسا انتہا پسند بنالینا اور دنیا بھر کی آنکھیں حقائق سے بند کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

خود اُس جماعت کے لیے بھی یہ چیز زہر کا حکم رکھتی ہے جو اجتماعی اصلاح و تعمیر کا کوئی پروگرام لے کر اٹھی ہو۔

مزاج کی بے اعتدالی کا اولین مظہر انسان کے ذہن کا یک رُخا پن ہے۔ اس کیفیت میں مبتلا ہو کر آدمی بالعموم ہر چیز کا ایک رُخ دیکھتا ہے، دوسرا رُخ نہیں دیکھتا۔ ہر معاملے میں ایک پہلو کا لحاظ کرتا ہے، دوسرے کسی پہلو کا لحاظ نہیں کرتا۔ ایک سمت جس میں اس کا ذہن ایک دفعہ چل پڑتا ہے اُسی کی طرف وہ بڑھتا چلا جاتا ہے، دوسری سمتوں کی جانب توجہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اُس سے معاملات کو سمجھنے میں مسلسل ایک خاص طرح کے عدم توازن کا ظہور ہوتا ہے۔ رائے قائم کرنے میں بھی وہ ایک ہی طرف جھکتا چلا جاتا ہے۔ جس چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے بس اسی کو پکڑ بیٹھتا ہے، دوسری ویسی ہی اہم چیزیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم چیزیں اس کے نزدیک غیر وقیع ہو جاتی ہیں۔ جس چیز کو بُرا سمجھ لیتا ہے اسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، دوسری ویسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی برائیاں اس کے نزدیک قابلِ توجہ نہیں ہوتیں۔ اصولیت اختیار کرتا ہے تو جمود کی حد تک اصول پرستی میں شدت دکھانے لگتا ہے، کام کے عملی تقاضوں کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ عملیت کی طرف جھکتا ہے تو بے اصولی کی حد تک عملی بن جاتا ہے اور کامیابی کو مقصود بالذات بنا کر اس کے لیے ہر قسم کے وسائل و ذرائع استعمال کر ڈالنا چاہتا ہے۔

یہ کیفیت اگر اس حد پر نہ رک جائے تو آگے بڑھ کر یہ سخت انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر آدمی اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے لگتا ہے۔ اختلافِ رائے میں شدت برتنے لگتا ہے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو انصاف کے ساتھ نہ دیکھتا ہے، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ ہر مخالف رائے کو بدتر سے بدتر معنی پہنا کر ٹھکرانا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز روز بروز اسے دوسروں کے لیے اور دوسروں کو

اس کے لیے ناقابل برداشت بنائی چلی جاتی ہے۔

اس مقام پر بھی بے اعتدالی رک جائے تو خیریت ہے۔ لیکن اگر اسے خوبی سمجھ کر مزید پرورش کیا جائے تو پھر معاملہ بدمزاجی، اور جرح جرأت ہیں، اور تیز زبانی، اور دوسروں کی نیتوں پر شک اور حملوں تک پہونچ جاتا ہے جو کسی اجتماعی زندگی میں بھی نبھنے والی چیز نہیں ہے۔

ایک آدمی یہ روش اختیار کرے تو زیادہ سے زیادہ انتہا یہی ہوگا کہ وہ اکیلا جماعت سے کٹ جائے گا اور اس مقصد کی خدمت سے محروم رہ جائے گا جس کی خاطر وہ جماعت سے وابستہ ہوا تھا۔ اس سے کوئی اجتماعی نقصان واقع نہ ہوگا۔ مگر جب کسی اجتماعی ہیئت میں بہت سے غیر متوازن ذہن اور غیر معتدل مزاج جمع ہو جائیں تو پھر ایک ایک قسم کا عدم توازن ایک ایک ٹولی کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایک انتہا کے جواب میں دوسری انتہا پیدا ہوتی ہے۔ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں۔ پھوٹ پڑتی ہے۔ دھڑے بندی ہوتی ہے۔ اور اس کشمکش میں وہ کام خراب ہو کر رہتا ہے جسے بنانے کے لیے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کچھ لوگ جمع ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کام انفرادی کوششوں سے کرنے کے نہیں ہوتے، بلکہ جن کی نوعیت ہی اجتماعی ہوتی ہے، انہیں انجام دینے کے لیے بہرحال بہت سے لوگوں کو ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات سمجھانی اور دوسروں کی بات سمجھنی ہوتی ہے۔ طبیعتوں کا اختلاف، قابلیتوں کا اختلاف، ذاتی خصوصیات کا اختلاف اپنی جگہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود سب کو آپس میں موافقت کا ایک تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی تعاون ممکن نہیں ہوتا۔ اس موافقت کے لیے کسر وانکسار ناگزیر ہے۔ اور یہ کسر وانکسار صرف معتدل مزاج کے لوگوں ہی میں ہو سکتا ہے جن کے خیالات بھی متوازن ہوں اور طبیعتیں بھی متوازن۔ غیر متوازن لوگ جمع ہو بھی جائیں تو زیادہ دیر تک جمع رہ نہیں سکتے۔ ان کی جمعیت پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، اور جن گروہوں میں تقسیم ہو کر ایک ایک قسم کے عدم توازن کے مریض جمع ہوں گے، ان میں پھر تفرقہ رونما ہوگا، یہاں تک کہ آخر کار ایک ایک امام مقتدیوں کے بغیر ہی کھڑا نظر آئے گا۔

جن لوگوں کو اسلام کے لیے کام کرنا ہو، اور جنہیں جمع کرنے والی چیز اسلامی اصول پر نظام زندگی کی اصلاح و تعمیر کرنے کا جذبہ و ولولہ ہو، انہیں اپنا محاسبہ کرکے اس بے اعتدالی کی ہر شکل سے خود بھی بچنا چاہیے اور ان کی جماعت کو بھی یہ فکر ہونی چاہیے کہ اُس کے دائرے میں یہ مرض نشو و نما نہ پائے۔ اس باب میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی وہ ہدایات اُن کے پیشِ نظر رہنی چاہییں جو انتہا پسندی اور شدت سے منع کرتی ہیں۔ قرآن جس چیز کو اہلِ کتاب کی بنیادی غلطی قرار دیتا ہے وہ غلو فی الدین ہے (یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ) اور اس سے بچنے کی تاکید نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین کو ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

ایاکم والغلو فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین۔ (مسند احمد بروایت ابن عباس)

خبردار! انتہا پسندی میں نہ پڑنا۔ کیونکہ تم سے پہلے کے لوگ دین میں انتہا پسندی اختیار کرکے ہی تباہ ہوئے ہیں۔

ابن مسعود کی روایت ہے کہ حضور نے ایک تقریر میں تین بار فرمایا:-

ھلک المتنطعون (مسلم)

برباد ہو گئے شدت اختیار کرنے والے، مبالغے اور تعمق سے کام لینے والے۔

دعوتِ محمدی کا امتیازی وصف اُس کے لانے والے نے یہ بتایا ہے کہ بُعثتُ بالحنیفیۃ السمحۃ یعنی آپ پچھلی امتوں کی افراط و تفریط کے درمیان وہ حنیفیت لے کر آئے ہیں جس میں وسعت اور معاملاتِ زندگی کے ہر پہلو کی رعایت ہے۔ اس دعوت کے علم برداروں کو جس طریقے پر کام کرنا چاہیے وہ اس کے داعیِ اول نے یہ سکھایا ہے:-

یسّروا ولا تعسّروا وبشّروا ولا تنفّروا (بخاری ومسلم)

سہولت دو، تنگ نہ کرو، بشارت دو، نفرت نہ دلاؤ۔

انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا

تم سہولت دینے کے لیے بھیجے گئے ہو، تنگ کرنے

معسرین۔ (بخاری) کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین قط الا اخذ ایسرھما مالم یکن اثما (بخاری ومسلم) کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو معاملوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا موقع دیا گیا ہو اور آپؐ نے ان میں سے آسان تر پہلو کو نہ اختیار کیا ہو، الا یہ کہ وہ گناہ ہو۔

ان اللہ رفیق یحب الرفق فی الامر کلہ (بخاری ومسلم) اللہ نرم خو ہے، ہر معاملے میں نرم رویّے کو پسند کرتا ہے۔

من یحرم الرفق یحرم الخیر کلہ (مسلم) جو نرم خوئی سے محروم ہوا وہ بھلائی سے بالکل محروم ہو گیا۔

ان اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف ومالا یعطی علی ماسواہ (مسلم) اللہ نرم خو ہے اور نرم خو آدمی کو پسند کرتا ہے۔ وہ نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو شدت پر اور کسی دوسرے رویّے پر عطا نہیں کرتا۔

ان جامع ہدایات کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ، اسلامی نظام زندگی کے لیے کام کرنے والے لوگ اگر قرآن و سنت سے اپنے مطلب کی چیزیں چھانٹنے کے بجائے اپنے مزاج اور نقطۂ نظر کو اُن کے مطابق ڈھالنے کی عادت ڈالیں تو ان کے اندر آپ سے آپ وہ توازن اور توسط و اعتدال پیدا ہوتا چلا جائے گا جو دنیا کے حالات و معاملات کو قرآن و سنت کے دیے ہوئے نقشے پر درست کرنے کے لیے درکار ہے۔

بے اعتدالیِ مزاج سے ملتی جلتی ایک اور کمزوری بھی انسان میں ہوتی ہے جسے تنگ دلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جسے قرآن میں ”شُحِّ نفس“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فلاح اس شخص کے لیے ہے جو اس سے بچ گیا (وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ)

اور جسے قرآن تقویٰ اور احسان کے برعکس ایک غلط میلان قرار دیتا ہے (وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا)۔ اس مرض میں جو شخص مبتلا ہو وہ اپنی زندگی کے ماحول میں دوسروں کے لیے کم ہی گنجائش چھوڑنا چاہتا ہے۔ وہ خود جتنا بھی پھیل جائے، اپنی جگہ اسے تنگ ہی نظر آتی ہے، اور دوسرے جس قدر بھی اس کے لیے سکڑ جائیں اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنے لیے وہ ہر رعایت چاہتا ہے، مگر دوسروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر سکتا۔ اپنی خوبیاں اس کے نزدیک ایک صفت ہوتی ہیں اور دوسروں کی خوبیاں محض ایک اتفاقی حادثہ۔ اپنے عیوب اس کی نگاہ میں قابلِ معافی ہوتے ہیں، مگر دوسروں کا کوئی عیب وہ معاف نہیں کر سکتا۔ اپنی مشکلات کو تو وہ مشکلات سمجھتا ہے، مگر دوسروں کی مشکلات اس کی رائے میں محض بہانہ ہوتی ہیں۔ اپنی لغزشوں کے لیے جو الاؤنس وہ خود چاہتا ہے دوسروں کو وہ الاؤنس دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ دوسروں کی مجبوریوں کی پروا کیے بغیر وہ اُن سے وہ انتہائی مطالبات کرتا ہے جو خود اپنی مجبوری کی صورت میں وہ کبھی پورے نہ کرے۔ اپنی پسند اور اپنا ذوق وہ دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر دوسروں کی پسند اور ان کے ذوق کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ چیز ترقی کرتی رہے تو آگے چل کر خردہ گیری و عیب چینی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسروں کی ذرا ذرا سی باتوں پر آدمی گرفت کرنے لگتا ہے، اور پھر جوابی عیب چینی پر بلبلا اٹھتا ہے۔

اسی تنگ دلی کی ایک اور شکل زود رنجی، نک چڑھاپن، اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا ہے۔ جو اجتماعی زندگی میں اس شخص کے لیے بھی مصیبت ہے جو اس میں مبتلا ہو اور اُن لوگوں کے لیے بھی مصیبت جنہیں ایسے شخص سے واسطہ پڑے۔

کسی جماعت کے اندر اس بیماری کا گھر کرنا حقیقت میں ایک خطرے کی علامت ہے۔ اجتماعی جدوجہد بہر حال دین کی اطاعت اور باہمی تعاون چاہتی ہے جن کے بغیر چار آدمی بھی مل کر کام نہیں کر سکتے۔ مگر تنگ دلی اس کے امکانات کو کم ہی نہیں بسا اوقات ختم کر دیتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تعلقات کی تلخی اور باہمی

(بقیہ ص ۶۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سنت کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا موقف

(۳)

چارمابہ النزاع صورتیں | سب سے زیادہ جس چیز میں فقہاء اور ارباب اصول کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ ایسی روایت کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتے تھے جو قیاس و درایت کے خلاف ہوتی تھی؟ کیا امام موصوف

(الف) خلافِ قیاس ہونے کی شکل میں خبرِ واحد کو رد کر دیتے تھے اور اس مخالفت کو روایت میں کسی پوشیدہ ضعف اور علت کے وجود پر محمول کرتے تھے ——؟

(ب) یا اس اصول کے مدِنظر کہ نص چاہے ظنی ہی کیوں نہ ہو، اس کے مقابلے میں قیاس کوئی اہمیت نہیں رکھتا، امام صاحب قیاس کو ترک کر کے خبرِ واحد پر عمل کرتے تھے ——؟

(ج) یا ایسی صورت میں فقیہ راوی کی روایت اُن کے نزدیک قابلِ ترجیح ہوتی تھی اور غیر فقیہ کی قابلِ تردید ——؟

(د) یا وہ غیر فقیہ کی روایت کو بھی اس شرط کے ساتھ تسلیم کر لیتے تھے کہ وہ کبھی قیاس و درایت کے منافی نہ ہو، بلکہ اس میں کسی ایسی توجیہ کی گنجائش باقی ہو جو اُسے کسی پہلو سے قیاس و درایت سے ہم آہنگ رکھے۔

الغرض یہ مسئلہ اہلِ فقہ و نظر کے مابین کافی اختلافات و نزاعات کا موضوع بنا ہوا ہے اور اس سلسلے میں مختلف اصحابِ مسلک میں پہلا اختلافی نقطہ یہ ہے کہ جو روایت قیاس سے یا شریعتِ اسلامی کے

مسلّمہ اصولوں میں سے کسی اصل سے متعارض ہو، اُس کی اصل حیثیت کیا ہے یعنی کیا وہ قابلِ قبول ہے یا نہیں؟ اور دوسرا اختلافی پہلو وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کیا موقف تھا۔؟ اور علماء نے امام صاحب کے مسلک کے متعلق جن مختلف آراء و خیالات کو واضح کیا ہے، اُن میں سے امام صاحب کی اپنی اصل رائے کون سی ہو سکتی ہے۔ پہلے ہم مختصر طور پر قسمِ اول کے اختلافات کا ذکر کریں گے اور اس کے بعد دوسری شق کے اختلافات کا جائزہ لیں گے اور آخر میں تمام منقولہ روایات و اقوال کی روشنی میں امام صاحب کے اصل موقف کی تحقیق کریں گے۔

خبر واحد کے بارے میں فقہائے اثر کا مسلک اور ان کے دلائل

ترجیح خبر واحد کے باب میں علمائے امت کے درمیان مختلف نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ فقہائے اثر ــــ یا اہل الحدیث ــــ کا مسلک یہ ہے کہ خبر واحد قیاس پر مرجّح ہے۔ اپنے مسلک کی تائید میں جو دلائل وہ پیش کرتے ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

۱۔ اصولی بات ہے کہ قیاس اور رائے کو وہاں اختیار کیا جاتا ہے، جہاں سرے سے کتاب و سُنت کی کوئی نص نہ موجود ہو، جب نص (بصورتِ خبر واحد) موجود ہے، تو قیاس کی گنجائش باقی نہ رہی۔

۲۔ جس خاص ضرورت کے درپیش آنے پر قیاس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اُس کا اتمام ایک ایسے اثر سے ہو رہا ہوتا ہے جن کی نسبت بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی طرف ہے۔

۳۔ قیاس کی بنیاد ظن پر استوار ہوتی ہے، یعنی مجتہد جس منصوص حکم کی علت پر قیاس کر کے غیر منصوص مسئلے پر حکم لگاتا ہے، وہ علت مجتہد اپنے ظن کی بنا پر مستنبط کرتا ہے۔ اسی طرح خبر واحد بھی اپنے ثبوت اور تحقق کے لحاظ سے ظنی ہوتی ہے۔ جب دو ظنی امور کا باہم تعارض ہو جائے، جن میں سے ایک کی نسبت ذاتِ رسول کی طرف ہو، اور دوسرا فقیہ کی طرف منسوب ہو رہا ہو تو عقل و منطق کا تقاضا یہ ہے کہ اول الذکر کو ترجیح ہو گی۔

۴۔ اکابر صحابہ جیسے ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضوان اللہ علیہم اجمعین اور جلیل القدر تابعین کا طرزِ عمل بھی یہی تھا کہ جب کوئی ایسی روایت اُن تک پہونچ جاتی جو ان کی اپنی قائم کردہ رائے سے متصادم ہوتی تو وہ بلا تردد اپنی رائے سے رجوع کر لیتے اور روایت کے مطابق عمل کرتے۔ آثارِ صحابہ و تابعین کی کتابوں میں اس طرح کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پہلی رائے یہ تھی کہ عورت اپنے شوہر کی دیت میں وارث نہیں ہے۔ مگر جب ضحاک کلبی کی روایت اُن کے علم میں آئی، تو وہ اپنی رائے سے دست بردار ہو گئے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما پہلے بٹائی پر کاشت (مخابرہ) کرنے کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے، مگر رافع بن خدیج نے جب اُن سے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا ہے، تو ابن عمر نے اپنی رائے کو ترک کر دیا۔ اسی طرح ایک اثر یہ بھی ملتا ہے کہ خلیفۂ اسلام حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عیب کی بنا پر خریدی ہوئی چیز کو واپس کرنے کے بارے میں ....

.... پہلے ایک فیصلہ صادر فرمایا تھا، مگر جب انہیں الخراج بالضمان والی روایت پہونچی، تو انہوں نے اپنا وہ فیصلہ منسوخ کر دیا۔ کیونکہ وہ اس روایت کے خلاف تھا۔

غرضیکہ عام فقہائے اثر اسی مسلک کے پابند ہیں۔ چنانچہ وہ کسی بھی روایت کی موجودگی میں، خواہ اُس کے راوی آحاد ہوں اور اس میں کوئی پوشیدہ ضعف پایا جاتا ہو، رائے زنی کو جائز نہیں ٹھیراتے ہیں اور نہ ہی راوی کے اندر درایت وفقاہت پائے جانے یا روایت کے موافق عقل و قیاس ہونے کی شرایط عائد کرتے ہیں۔ ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ اور اس کی تمام تفصیلات اپنی مشہور کتاب "الرسالۃ" میں بیان کی ہیں۔ اسی مسلک کی بنا پر انہوں نے کثرت سے ایسی احادیث و روایات پر اعتماد کیا ہے۔ جن میں سے بعض کی تردید بھی امام مالک رحمۃ اللہ سے منقول ہے، کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ کے خیال میں وہ احادیث، شریعتِ اسلامی کے اُن معروف اور ثابت شدہ اصولوں سے ہٹی ہوئی ہیں جنہیں اہلِ علم نے آیاتِ قرآنی اور مشہور احادیثِ نبوی کے تتبع و استقراء سے مستنبط کیا ہے۔

فقہائے حنفیہ کے دو مسلک

خبر واحد کے باب میں حنفیہ میں سے شیخ ابوالحسن کرخیؒ بھی اس باب میں

فقہائے اثر اور امام شافعی کے ہم خیال ہیں۔ ان کی رائے میں کسی حدیث کے واجب الاتباع ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ اُس کے رُواۃ عدالت وضبط کے معیار پر پورے اُترتے ہوں، باقی رہا راوی کا فقیہ ہونا تو یہ شرائطِ قبولیت وترجیح میں سے نہیں ہے۔ حنفیہ میں سے عیسیٰ بن ابان کا قول کرخی کی رائے سے مختلف ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ اگر راوی عادل وضابط ہونے کے ساتھ ساتھ فقاہت و درایت میں بھی مشہور ہے تو بلاشبہ اُس کی روایت قیاس پر مقدم ہوگی۔ ورنہ بصورتِ دیگر اس کی روایت محلِ غور رہے گی۔ اور مجتہد کا اجتہاد اُس کا فیصلہ کرے گا۔ عیسیٰ بن ابان نے اپنے نقطۂ نگاہ کا استشہاد اس سے کیا ہے کہ صحابۂ کرام نے بالعموم راوی میں عدمِ تفقہ کی بنا پر خبرِ واحد کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ قیاس کو بنائے عمل بنایا ہے۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ روایت کرتے سُنا کہ الوضوء مما مسته النار (یعنی جس چیز کو آگ نے چھولیا ہو اس کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ تو انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا "کیا گرم پانی سے وضو کرنے کے بعد، تم دوبارہ وضو کروگے؟"۔ ایک اور موقع پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ من حمل جنازۃ فلیتوضأ (جس شخص نے جنازہ اُٹھایا ہو اُسے وضو کرنا چاہیے) تو حضرت ابن عباس نے ٹوکا کہ کیا سوکھی لکڑیوں کے اُٹھانے سے آپ ہم پر وضو لازم کرتے ہیں؟۔ اسی طرح حضرت علی نے بروع بنت واشق[1] والی روایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور اپنے قیاس پر قائم رہے تھے۔ علیٰ ہذا القیاس صحابہ وتابعین سے متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کا استقصار اس موقع پر ضروری نہیں ہے۔

---

[1] نسائی میں یہ روایت آتی ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعود سے ایک ایسی عورت کے حق مہر کے بارے میں استفسار کیا گیا، جس کے شوہر نے اُس کا مہر معین نہیں کیا تھا اور وہ خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی انتقال کر گیا تھا۔ آپ نے جواب دیا کہ ایسے معاملے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ مجھے معلوم نہیں۔ لوگ ایک ماہ تک متواتر اصرار کرتے رہے بالآخر آپ نے عورت کے لیے مہرِ مثل کا فتویٰ دیا۔ یہ سن کر حضرت معقل بن یسار کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا: خدا کی قسم! آپ نے وہی فیصلہ دیا ہے جو ہمارے قبیلہ کی ایک عورت بروع بنت واشق الاشجعیہ کے بارے میں خود رسول اللہ

عیسیٰ بن ابان اور ان کے ہم خیال حضرات کے مزید دلائل خبر واحد پر ترجیحِ قیاس کے قائلین اپنے مذہب کی صحت میں یہ دلائل بھی پیش کرتے ہیں کہ قیاس کو از روئے اجماعِ صحابہ حجتِ شرعی ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ قیاس کے مقابلے میں خبر واحد ہے جس کا قولِ رسول ہونا امرِ مظنون ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جس حکم کی بنیاد قیاس پر ہوگی — جو کہ بالاجماع ایک ماخذ شریعت قرار پا چکا ہے — وہ اس حکم سے زیادہ مضبوط اور قوی ہوگا جس کی بنیاد خبر واحد (امر مظنون) پر ہوگی۔ نیز اخبار آحاد کی بہ نسبت قیاس کے قوی الاساس ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خبر واحد میں راوی کے سہو و نسیان اور غلط فہمی کا امکان ہر وقت موجود ہے۔ مگر قیاس میں ان احتمالات کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ اسی طرح قیاس میں تخصیص کا امکان بھی نہیں ہوتا (یعنی اس میں عمومیت پائی جاتی ہے اور وہ کسی خاص موقع و محل سے وابستہ نہیں ہوتا) بخلاف اس کے خبر واحد میں اس امر کا امکان ہوتا ہے کہ وہ حکم شارع علیہ السلام نے کسی خاص موقع و محل اور کسی خاص کیفیت و کمیت کی مناسبت سے فرمایا تھا، جسے اب راوی یاد نہ رکھ سکا ہو۔ اس لیے غیر محتمل (قیاس) محتمل (خبر واحد) سے اولیٰ و انسب ہے۔

مذکورہ بالا آراء کی غلطی یہ حضرات اس قسم کے استدلالات کی ایک طویل فہرست تائیدِ مسلک میں لاتے ہیں۔ ان تمام استدلالات کی حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کے مقدمات کو جن پر یہ قائم ہیں درست تسلیم کر لیا جائے تو غیر فقیہ راوی کی روایت تو درکنار سرے سے خبر واحد ہی معرضِ قدح میں آجاتی ہے۔ لیکن بجائے خود ان استدلالات کے مقدمات ہی محلِ نظر ہیں۔ من حیث المجموع ان مقدمات کی تعمیر مفروضے پر کی گئی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ لیکن حضرت علی نے اس فتوے کی مخالفت کی اور فرمایا: "ہم ایک بدوی کے قول کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔" آپ کا خیال تھا کہ یہ قرآن کریم کے اس حکم پر ہے کہ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ (تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اگر تم عورتوں کو طلاق دیدو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انہیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے) اسی حالت میں طلاق دینے سے چونکہ مہر کی رقم مقرر کرنا قرآن نے ضروری نہیں قرار دیا اس لیے آپ نے موت کو طلاق پر قیاس کر کے مہر مثل کی مخالفت کی۔ (مترجم)

وہ یہ ہے کہ قیاس ایک قطعی شے ہے ، اس میں غلط فہمی اور کذب کا کوئی احتمال نہیں پایا جاتا۔ اور نہ ہی کسی قسم کے سہو و نسیان کا اس میں امکان ہوتا ہے۔ مگر امر واقع یہ ہے کہ قیاس ہر پہلو سے مختلف احتمالات کی زد میں ہے۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قیاس کی اساس بھی ظن پر قائم ہے۔ قیاس کی حقیقت یہ ہے کہ جب مجتہد قرآن یا حدیث کی کسی اصلِ منصوص پہ قیاس کر کے کسی غیر منصوص معاملے پر حکم لگانا چاہتا ہے تو وہ اصلِ منصوص کے اندر پائے جانے والے تمام اوصاف کا جائزہ لیتا ہے اور ان میں سے اُس وصف کا استخراج کرتا ہے جو درحقیقت حکم کا مدار و موجب ہوتا ہے (اسی وصف کو اصطلاح فقہ میں علت کہتے ہیں۔ اور یہ علت جن فروعات میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہوگی وہ اُس اصلِ منصوص کے تحت داخل ہوں گی) پس ہم جب یہ کہتے ہیں کہ خود قیاس کی بنیاد ہی ظن پر قائم ہے ، تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب مجتہد اصلِ منصوص کے اوصاف کا جائزہ لے کر ، اُن میں سے ایک وصف کو متشخص کر کے (اپنی دانست میں) علتِ حکم قرار دیتا ہے تو اس امر کا احتمال ہر حال میں باقی ہے کہ آیا اُس کا تشخیص کردہ وصف ہی مدارِ حکم تھا یا کوئی دوسرا وصف۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح خبر واحد کے ثبوت میں احتمالِ شبہ تسلیم کیا جاتا ہے ، اسی طرح قیاس بھی اُسی قسم کے اشتباہ کے احتمال سے محفوظ نہیں ہے۔ بلکہ نسبتہً قیاس میں اشتباہ کا احتمال زیادہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ احتمال تو قیاس کی بنیاد ہی میں موجود ہے۔ مگر خبر واحد میں احتمال کا وجود بنیاد میں نہیں ہے بلکہ صرف راوی کے اندر عارضہ سہو و نسیان کے لاحق ہونے کی صورت ہی میں پیدا ہوتا ہے اور اگر راوی کے اندر عدالت و ضبط کی صفات ہوں تو اس عارضے کی بھی نفی ہوجاتی ہے اور احتمالِ اشتباہ بالکل زائل ہوجاتا ہے۔

اس گروہ کے خیالات و نظریات پہ بحث ختم کرنے سے قبل یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ گروہ اس کا تو قائل نہیں کہ تصادمِ قیاس کے وقت بالکلیہ غیر فقیہ راوی کی حدیث قیاس پر مرجح ہے (جیسا کہ فقہائے حدیث اور امام شافعی کا مذہب ہے) مگر یہ اُسے بالکلیہ رد کر دینے کا بھی قائل نہیں ہے۔ بلکہ اس موقع پر مجتہد فہم و فراست اور تفکر و تدبر سے کام لے گا۔ اور اگر اُسے کوئی ایسی صورتِ توجیہ و تاویل نظر آجائے جو روایت کو بہمہ وجوہ عقل و درایت کے منافی ہونے سے روک لے ، تو اُسے اس بنیاد پر قبول کر لے گا کہ اگرچہ ایک پہلو سے وہ معارضِ عقل و درائے ہے مگر کسی دوسرے پہلو سے وہ اُس کے مطابق بھی ہے۔ یہی مفہوم ہے حنفیہ کے اس

قول کا کہ "غیر فقیہ، عادل و ضابط شخص کی خبر متروک العمل نہیں ہوگی الّایہ کہ ضرورت اس کی متقاضی ہو یعنی اُس خبر کو عقل عامہ اور فہم و درایت سے سازگار کرنے کیلیے کوئی توجیہ نہ ہوسکتی ہو" یہ معاملہ اُس روایت کے ساتھ اختیار کیا جائے گا، جو عادل و ضابط شخص سے مروی ہوگی۔ لیکن اگر راوی گم نام اور مجہول العدالۃ ہے تو اس گروہ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق اُس میں مجتہد کو تاویل و توجیہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اُسے متروک العمل سمجھا جائیگا اور قیاس ہی کو ماخذِ عمل بنایا جائے گا۔

عیسی بن ابان کے (جو اس گروہ کے سرخیل ہیں) سرگرم مؤیدین اور مدافعین میں امام فخر الاسلام بزدوی بھی ہیں۔ بلکہ بزدوی کا دعوٰے ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کی بھی یہی رائے ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق بزدوی کا دعویٰ کافی غور طلب ہے۔ اور ہم اس مضمون کے آخر میں ان شاء اللہ اس پر مفصل کلام کریں گے۔

ابو الحسین بصری کے نزدیک قیاس کی چار قسمیں

ابو الحسین بصری نے خبر آحاد اور قیاس کے معارضہ پر نہایت عمدہ بحث کی ہے اور قیاس کی چار قسمیں بیان کی ہیں:۔

پہلی قسم یہ ہے کہ قیاس کا مبنیٰ نص قطعی ہو۔ یعنی جس حکم پر قیاس کو استوار کیا جا رہا ہو، اُس کا ثبوت ایسے مآخذ سے بہم پہونچ رہا ہو جو صحت و یقین میں قطعیت کے درجے میں ہوں۔ جیسے آیاتِ قرآنی اور مشہور احادیث۔ اور حکم کی علت بھی نص میں واضح کردی گئی ہو۔ ایسے قیاس کا خبر واحد سے متصادم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قیاس سے ثابت شدہ حکم، براہ راست نص قطعی سے ثابت ہونے والے حکم کے مساوی ہوگا۔ بدیں وجہ کہ جس اصل کو بنائے قیاس قرار دیا گیا ہے، وہ خود بھی نص قطعی سے ماخوذ ہے اور اس کی علت بھی از روئے نص ثابت ہے۔ اس کے برعکس خبر واحد ظنی الثبوت ہے اور نص قطعی کے روبرو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ لہذا خبر واحد کو رد کردیا جائے گا اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اُس کی صحتِ نسبت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

دوسری قسم وہ ہے کہ قیاس کا استناد جس اصل پر ہو وہ خود بھی ظنی ہو اور اس کی علت بھی منصوص نہ ہو بلکہ استنباط سے معین کی گئی ہو۔ اس قسم کے قیاس پر خبر واحد کو ترجیح ہے۔ اول اس لیے کہ خبر واحد سے

حکم کا اثبات براہِ راست اور بالصراحت ہو رہا ہے۔ اور قیاس سے بالواسطہ۔ اور ثانیاً یہ کہ قیاس میں ظن کے متعدد پہلو موجود ہیں۔ مثلاً اصلِ مقیس علیہ (جس پر قیاس کو استوار کیا جا رہا ہے) ظنی ہے۔ علت کو استنباط سے مشخص کیا گیا ہے، اس لیے وہ بھی ظنی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ حکم زیادہ قابلِ اطمینان و اعتماد ہے جس میں صرف ایک پہلو سے ظن پایا جاتا ہے نہ کہ وہ جس کا ہر ذریعۂ ثبوت ظنون میں گھرا ہوا ہے۔

ابوالحسین بصری کا دعویٰ ہے کہ پہلی قسم میں ترجیح قیاس میں اور دوسری قسم میں ترجیح خبر میں تمام علمائے فقہ کا اجماع ہے۔

قیاس کی تیسری صورت یہ ہے کہ اصل اور علت دونوں کا اثبات نصِ ظنی سے ہو۔ اس شکل میں اگرچہ خبرِ واحد اور قیاس کے مساوی المرتبہ ہو جانے کی وجہ سے تعارض پیدا ہو جاتا ہے مگر ابوالحسین بصری کا اس قسم کے بارے میں بھی یہ دعویٰ ہے کہ علماء بالاجماع خبرِ واحد کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کی دلیل وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے، کہ خبرِ واحد سے اثباتِ حکم واضح طور پر ہوتا ہے اور قیاس سے کئی درمیانی واسطوں سے گزر کر۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ قیاس کی بنیاد قرآن یا حدیثِ متواتر کی نصِ قطعی پر مشتمل ہو، مگر اس کی علت نص میں مذکور نہ ہو بلکہ مستنبط ہو۔ اس قسم کے قیاس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ دونوں میں سے کس کو ترجیح ہے؟۔

ابوالحسین بصری نے پہلی تینوں قسموں میں علماء کا اتفاق ظاہر کر کے اختلافی بحث کو صرف چوتھی قسم تک محدود کر دیا ہے۔ لیکن عام علمائے فقہ سے جو کچھ اس بارے میں منقول ہے، اس سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس قضیے کا ہر پہلو بلا حصر و تخصیص فقہاء کے درمیان موجبِ اختلاف بنا رہا ہے۔

فقہائے امت کی اکثریت اصولِ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم امام شافعی، احمد بن حنبل اور بعد کے فقہائے

ثابتہ کو ترجیح دیتی ہے ظواہر کو مستثنیٰ کر دیں، تو صحابہ کے دور سے لے کر اجتہاد کے آخر تک

لے فقہاء و مجتہدین نے کتاب و سنت میں عموم و خصوص کے مدارج ایسے تتبع سے اصول مستخرج کیے ہیں جنہیں فقہ و تشریع میں بنیادیت کی حیثیت حاصل ہے۔ ابن نجیم مصری نے اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں لکھا ہے کہ "یہی قواعد درحقیقت

زمانے تک جملہ فقہائے امت کا طرز عمل ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ انہوں نے جہاں اصولِ ثابتہ کے خلاف خبرِ احد کو پایا ہے، اُسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کی طرف اُس کی نسبت کا انکار کیا ہے۔ صحابہ وتابعین کے آثار سے اس طرزِ عمل کے ثبوت پر متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث کو کہ اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَاءِ اَھْلِہٖ[1] درست نہیں تسلیم کیا تھا۔ کیونکہ وہ قرآن کے اس اصول کے خلاف پڑتی تھی کہ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْریٰ یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اسی طرح ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے اُس روایت پر سخت تنقید کی تھی جس میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے رب کو دیکھنا مذکور ہے اور قرآن کریم کی آیت لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ (آنکھیں ذاتِ الٰہ کا ادراک نہیں کر سکتیں) کے مفہوم سے عدم مطابقت کی بنا پر اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے انہیں دھو لینا چاہیے۔" مگر حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فقہ استنباط کی بنیاد ہیں۔ اور فقیہ انہی کے توسط سے مرتبہ اجتہاد تک پہنچتا ہے۔ علمائے فقہ کے لیے ان قواعد کی تدوین و ترتیب ہمیشہ باعثِ فخر رہی ہے۔" ان قواعد کی مجموعی تعداد علماء نے مختلف بیان کی ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ جامعہ بھی انہی قواعد کی فہرست میں داخل ہیں۔ مثلاً آپ کا ارشاد مبارک کل مسکر حرام (ہر نشہ آور چیز حرام ہے) لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق، کل شرط لیس فی کتاب اللہ فہو باطل۔ اسی طرح قرآن کی وہ آیات بھی انہی قواعد میں شمار ہوتی ہیں جن میں کسی اصولی بات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسے قواعد کی تفصیلات قرافی کی الفروق، ابن نجیم کی الاشباہ والنظائر اور اس کی شرح غمز عیون البصائر، فتح القدیر، الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، فقہ الاسلام اور دیگر اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ (مترجم)

[1] امام بخاری نے اس روایت کو بیان کیا ہے کہ ایک بار حضرت ابن عمر نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کی کہ "پس ماندگان کے نوحہ کرنے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔" حضرت عائشہ نے ابن عمر کے الفاظ سنے تو فرمایا کہ ابن عمر نے آں حضورؐ کے ارشاد کو اس کے صحیح موقع و محل کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ آپؐ ایک یہودی عورت کی قبر سے گذرے جس کے اعزہ رو دھو رہے تھے، تو آپؐ نے فرمایا یہ لوگ یہاں اس کا نوحہ کر رہے ہیں اور وہ قبر میں مبتلائے عذاب ہے۔ (مترجم)

رفع حرج کے قاعدہ کے تحت اسے نہیں مانتے تھے۔

امام مالکؒ اصولِ ثابتہ کو ملحوظ رکھتے تھے

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ — جو اپنے زمانے میں مدینہ کے شیخ الفقہاء کے لقب سے پکارے جاتے تھے — اصولِ ثابتہ کے مقابلے میں خبرِ واحد کو متروک العمل سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حدیث: "من مات وعلیہ صیام فقد صام عنہ ولیہ" (جو شخص مرگیا اور اس کے ذمے رمضان کے روزے باقی تھے، تو اس کا ولی اُن کو پورا کرے) کو اختیار نہیں کیا کیونکہ یہ اصول رفع حرج[1] سے ٹکراتی تھی۔ ایسے ہی انہوں نے رفع حرج کے قاعدے کے پیشِ نظر "اکفاء القدور"[2] (ہانڈیاں اوندھانے) والی روایت کے خلاف فتوی دیدیا تھا۔ ابوبکر بن العربی کہتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ نے شوال کے چھے روزے رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ چھے روزے از روئے حدیث ثابت ہیں۔ مگر امام مالکؒ نے سدّ باب ذریعہ کے ضابطے کو اس حدیث پر ترجیح دی ہے۔ "ولوغ الکلب"[3] والی روایت کے بارے میں امام موصوف نے فرمایا تھا کہ "یہ حدیث تو ہے لیکن میں اس کی حقیقت نہیں جان سکا"۔ ابن عربی کی تصریح کے مطابق امام مالک کا یہ تذبذب اس بنا پر تھا کہ یہ حدیث کئی تشریعی ضابطوں سے متعارض ہوتی تھی۔ جن میں سے ایک قرآن کا یہ حکم بھی ہے کہ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَٰتُ وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ (تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال

---

[1] رفعِ حرج سے مراد یہ ہے کہ شریعت نے ہمیں ایسے احکام کا مکلف نہیں کیا جن سے غیر معمولی اور ناقابلِ برداشت مشقت اور دشواری لازم آتی ہو۔ اس قاعدے کی بنیاد قرآن کی متعدد آیات ہیں مثلاً يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ...... وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ...... نیز احادیث نبوی مثلاً الدین یسر (م)

[2] روایات میں آیا ہے کہ آں حضورؐ نے ایک غزوے میں اُن ہانڈیوں کو اُلٹا دینے کا حکم فرمایا تھا جن میں بعض مجاہدین نے غنیمت کے جانوروں کو تقسیم سے پہلے ذبح کرکے ان کا گوشت پکانا شروع کر دیا تھا۔ غالباً امام مالکؒ کا استدلال یہ تھا کہ غنائم کا یہ استعمال ایک اضطراری حاجت کی بنا پر تھا اور اس سے سرقہ یا غلول مقصود نہ تھا۔ چنانچہ امام مالک کی رائے میں شدید ضرورت کی بنا پر مجاہدین تقسیم سے قبل بھی غنیمت کا گوشت کھا سکتے ہیں اور ان کی یہ رائے اصول رفع حرج ہی پر مبنی ہے۔ (م)

[3] روایت میں ہے کہ جب کتا برتن میں سے پانی پی لے، تو اُس برتن کو ایک بار پاک مٹی سے اور چھ بار پانی سے دھونا چاہیے۔

کر دی گئی ہیں اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو — جن کو خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیتے ہو — وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو) اسی طرح امام موصوف نے بیع مصراۃ والی حدیث کو اہلِ عراق کی طرح قبول نہیں کیا ہے۔ (مصراۃ اس جانور کو کہتے ہیں جس کو بیچنے کے لیے اس کے تھن سے چند اوقات دودھ نہ نکالا گیا ہو، تاکہ خریدار تھن کی بڑائی دیکھ کر دھوکہ میں آ جائے) اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ایسا جانور خریدے وہ دوہنے اور حقیقتِ حال سے واقف ہو جانے کے بعد اختیار رکھتا ہے کہ چاہے جانور کو رکھے یا واپس کر دے۔ اگر واپس کرے تو نکالے ہوئے دودھ کے عوض اس کے مالک کو ایک صاع خرما دے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا اس حدیث کو قبول نہ کرنا اول تو اس وجہ سے تھا کہ یہ حدیث الخراج بالضمان (یعنی کسی شے کی حفاظت و ضمانت کے عوض میں اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے) کے تشریعی قاعدے کے مخالف ہے اور ثانیاً یہ کہ اگر کوئی چیز تلف ہو جائے۔ تو (قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ) اس کا تلف کرنے والا معاوضے میں اس چیز کی مثل یا (مثل نہ ہو سکتی ہو تو) اس کی قیمت ادا کرے۔ طعام یا کسی دوسری شے سے اس کا معاوضہ نہیں چکایا جائے گا۔ (لیکن اس حدیث کا کہنا یہ ہے کہ چاہے دودھ کتنا ہی نکالا ہو۔ ایک سیر نکالا یا دس بیس سیر بہرحال اس کا معاوضہ ایک ہی صاعِ خرما ادا کرنا چاہیے۔ اور یہ بات قیاس سے مطابقت نہیں رکھتی ہے) چنانچہ امام مالکؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں "انہ لیس بالموطأ ولا الثابت" (یہ حدیث تحقیق شدہ اور ثابت نہیں ہے)

امام ابو حنیفہ کا طرزِ عمل کیا تھا؟ | یہاں تک تو خلافِ قیاس روایت کے بارے میں عام فقہاء اور مجتہدین کے اقوال کا ذکر تھا۔ اب ہمیں ان گوناگوں خیالات و آراء کے ازدحام میں سے یہ جستجو کرنی ہے کہ اس بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کیا طرزِ عمل رکھتے تھے —؟

اس مسئلہ میں امام صاحب کی طرف علماء نے جن خیالات کو منسوب کیا ہے، اُن میں باہم اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے بعض فقہاء کے بیانات ہیں، جنہیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

ابن عبد البر کا بیان | ابن عبد البر امام صاحب کے معترضین اور طعنہ زنوں کی وجہِ مخالفت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اہل الحدیث میں سے اکثر لوگوں نے امام صاحب کو بکثرت ثقہ اور عادل رُواۃ کی حدیثوں کو قبول نہ کرنے

حرفِ مطاعن بنایا ہے۔ اور اس میں وہ حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ امام صاحب کا اصول تھا کہ وہ اخبار آحاد کو لیتے وقت پہلے انہیں قرآن اور حدیث کے مجموعی علم پر پرکھتے تھے۔ اور جس حدیث کو اُس سے ہٹا ہوا پاتے تھے اُسے شاذ قرار دے کر ترک کر دیتے تھے۔" ابن عبدالبر کے کلام کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ حدیث جو قرآن کے اصولی حقائق اور قواعد عامہ کی مخالفت کرنے والی ہو امام صاحب کو اس کی صحت تسلیم نہیں ہے۔ خواہ وہ اصولی حقائق نصوص سے ماخوذ ہوں، خواہ احکام کی علتوں پر غور و فکر کرنے کے بعد استنباط کے ذریعے معلوم کیے گئے ہوں۔ جو حدیث بھی اُن سے ہٹی ہوئی ہوگی وہ امام صاحب کے نزدیک شاذ ہوگی اور اسی بنا پر اُسے وہ قبول نہیں کریں گے۔

فخر الاسلام بزدوی کا بیان | کشف الاسرار کے مصنف فخر الاسلام بزدوی نے امام صاحب اور اُن کے اصحاب کی طرف جس مسلک کا انتساب کیا ہے، اُس کا حاصل یہ ہے کہ اگر حدیث مشہور راوی اجلۂ صحابہ سے مروی ہو تو اُسے قیاس پر فوقیت اور ترجیح ہوگی جیسے خلفائے اربعہ، ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، ابوموسیٰ اشعری، اُمّ المومنین عائشہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایات اور ان کے علاوہ اُن صحابہ کی روایات جو تفقہ اور اجتہاد میں شہرت اور نام وری سے سرفراز ہیں۔ اور اگر راوی ان صحابہ میں سے ہو جو اگرچہ عدالت وضبط میں معروف ہیں مگر فقاہت اور مجتہدانہ فہم کے لحاظ سے شہرت نہیں رکھتے ہیں، جیسے حضرت ابوہریرہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما وغیرہما، تو ان کی روایت اگر قیاس کے مطابق ہوگی تو اس پر بلا تردد عمل کیا جائے گا۔ اور اگر قیاس کے مخالف ہوگی تب بھی اُس روایت کو اُس وقت تک متروک نہیں گردانا جائے گا جب تک ہر سمت سے اُس کے بارے میں قیاس و رائے کا دروازہ مسدود نہ ہو جاتا ہو۔ قبولیتِ روایت میں وصفِ فقاہت کے التزام کی توجیہ فخر الاسلام نے یہ کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ مبارک کو بعینہٖ موقع ومحل کے ساتھ اور الفاظ وصیغوں کے ساتھ محفوظ رکھنا نہایت دشوار اور دقّت طلب کام ہے۔ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں روایت بالمعنیٰ کا رواج عام تھا۔ اس لیے اگر ارشادِ نبوی کے مفہوم و مدعا کا کلی ادراک کرنے اور اُس کے موقع ومحل کو محفوظ رکھنے میں راوی کا فہم قاصر رہ جائے تو وہ اس اندیشے سے

مامون نہیں ہے کہ ارشادِ مبارک کا کوئی حصہ اُس کے ذہن سے اوجھل ہوجائے اور اس میں کسی دوراز قیاس شبہے کا اضافہ ہوجائے۔ یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ کردینا بھی ضروری ہے کہ راوی کے فہم کے قاصر رہ جانے سے ہماری مراد صرف حدیث کے تفقہ و تعمق میں کوتاہی ہوجانے سے ہے۔ معاذ اللہ غیر فقیہ صحابہؓ کا استخفاف اور کسرِ شان یا اُن کی روایت کی اہمیت کو گھٹانا مقصود نہیں ہے۔ امام صاحب کے شاگردِ رشید امام محمدؒ نے متعدد مواقع پر ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ (جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ فقیہ نہیں تھے) کے مسلک کی پیروی کی ہے اور اُن کی روایات کو اپنے استدلال و استنباط کا ماخذ بنایا ہے۔ اسی سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ امام صاحب کی نگاہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اہمیت و وقعت کس قدر زیادہ ہوگی۔ بلکہ ہمارے اصحاب کا یہ باقاعدہ مسلک ہے کہ رائے اور قیاس کی گنجائش باقی رہنے کی حد تک حضرت ابوہریرہ، حضرت انس بن مالک اور ان کے ہم مرتبہ صحابۂ کرام کی روایات کو بھی ماخذِ عمل اور بنائے قیاس بنایا جاتا ہے۔ ہاں اگر ان روایات میں سے کوئی ایسی روایت موجود ہو جو ہر لحاظ سے عقل و درایت کے تقاضوں کی نفی کر رہی ہو تو اس کا تسلیم کرنا محال ہوگا، کیونکہ اس صورت میں وہ کتاب اللہ کی ناسخ، حدیثِ مشہور کی ناسخ اور اجماعِ امت کے معارض واقع ہوجائے گی۔ اس کی واضح مثال حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مُصرّاۃ ہے۔[1]

---

[1] فخر الاسلام بزدوی نے ایسی حدیث کے ناسخِ کتاب اور ناسخِ حدیثِ مشہور اور معارضِ اجماع ہونے کی مثالیں دیتے ہوئے بیان کیا ہے، کہ بالکلیہ عقلِ عام کے خلاف پڑنے والی روایت کو متروک قرار دینا ضروری ہے۔ ورنہ قرآن کا نسخ لازم آئے گا۔ کیونکہ قرآن میں آتا ہے فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔ اس آیت سے صریح طور پر عقل و بصیرت سے کام لینے کا حکم ثابت ہے۔ حدیث مصراۃ سے جس مشہور حدیث کا نسخ لازم آتا ہے وہ معاذ بن جبل والی حدیث ہے۔ اس حدیث کے معارضِ اجماع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قیاس پر عمل کرنا اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ اب جو روایت قیاس کا دروازہ بند کرے گی اس کی زد گویا ایک ماخذِ شرعی (یعنی اجماع) پر بھی پڑے گی۔ جو لوگ قیاس کو حجتِ شرعی تسلیم نہیں کرتے وہ ناقابلِ توجہ اور تیسری صدی کے مابعد کی پیداوار ہیں۔ حالانکہ قیاس دورِ صحابہ ہی میں حجتِ شرعی قرار پاچکا ہے۔

شارح تحریر الکمال کی رائے امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے نقطۂ نظر کے متعلق فخر الاسلام بزدوی کی رائے آپ نے ملاحظہ کر لی۔ مگر ایک اور اصولی نے التقریر والتحبیر شرح تحریر الکمال میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ فخر الاسلام کے بیان سے مختلف ہے۔ ان صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ امام صاحب اور اُن کے تلامذہ خبر واحد کے باب میں بعینہٖ اُسی نظریے کے قائل تھے جو امام شافعی اور دیگر محدثین کا تھا۔ یعنی وہ بلا تخصیص و بلا شرط خبر واحد کو قیاس پر مرجح ٹھیراتے تھے، اُس کا راوی خواہ فقیہہ ہو یا غیر فقیہہ اور روایت خواہ عقل و قیاس کے موافق ہو یا سراسر مخالف! تحریر الکمال کے متن کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب خبر واحد اور قیاس باہم متعارض ہوں اور دونوں میں تطبیق کی کوئی امکانی صورت باقی نہ رہے تو فقہاء کی اکثریت کے نزدیک جن میں ابو حنیفہ، شافعی اور احمد بن حنبل بھی شامل ہیں، خبر واحد کو علی الاطلاق قیاس پر ترجیح ہوگی"۔[1]

مختصر یہ کہ ان تمام مباحث سے ثابت ہو گیا کہ امام صاحب کا مسلک علماء کے درمیان متنازع فیہ ہے۔ امام صاحب سے ماثور ہونے والے اُن فقہی مسائل و فروعات سے، جن میں قیاس کا خبر واحد سے تعارض ہوا ہے، علماء نے امام موصوف کے نقطۂ نگاہ کی تحقیق و تشخیص میں جدا جدا نتیجہ برآمد کیا ہے۔ ابن عبدالبر کے کلام کا اشارہ ترجیح قیاس کی جانب ہے۔ بزدوی کا تفصیلی بیان آپ کے سامنے ہے۔ تیسرے صاحب کی تحقیق بتاتی ہے کہ راوی چاہے غیر فقیہہ ہو، روایت چاہے مخالفِ عقل و قیاس ہو، امام صاحب جملہ احوال میں تقدیمِ روایت ہی کے قائل ہیں۔ مگر امرِ واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب سے دونوں طرح کے مسائل مروی ہیں۔ اکثر ایسے مسائل بھی ہیں جن میں امام موصوف نے حدیث کو بنائے عمل بنایا ہے اور قیاس کو ترک کیا ہے اور ایک تعداد ایسے مسائل کی بھی ہمیں ملتی ہے جن میں وہ خبر واحد کو ترک کر جاتے ہیں اور قیاس پر عمل کرتے ہیں۔

(باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو التقریر والتحبیر شرح التحریر (مصنفہ کمال الدین محمد بن ہمام المصری) ج ۲ ص ۲۹۸۔ ابوالحسن کرخی اور دوسرے فقہائے حنفیہ کی کثیر تعداد کا رجحان اسی مسلک کی جانب ہے اور وہ اسی کو امام صاحب اور ان کے اصحاب سے منقول ہونے والے مسائلِ فقہیہ کے موافق پاتے ہیں۔

اسلامی تحریک میں کارکنوں کے باہمی تعلقات

یہ ایک طویل مگر مفید مقالہ ہے جسے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان نے اپنے کارکنوں کی رہنمائی اور تربیت کی غرض سے مرتب کیا ہے۔ اس میں بہت محنت کے ساتھ مواد متعلقہ کو کتاب و سنت سے جمع کر کے سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ دین حق کے پیرو کاروں اور تحریک اسلامی کے خدمت گزاروں کو ان شاء اللہ اس بحث سے بہت مدد اور روشنی حاصل ہوگی۔

اسلامی تحریک ایک اجتماعی انقلاب کی داعی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا یہ فریضہ بالکل اولین اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اپنے کارکنوں کو عام طور پر تمام انسانوں سے اور خاص طور پر باہم ایک دوسرے کے ساتھ صحیح صحیح بنیادوں پر مربوط کر دے۔ اسلامی تحریک کے کارکنوں کے باہمی تعلقات کو قرآن اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ

اگرچہ بظاہر یہ صرف تین الفاظ کا ایک مختصر سا فقرہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ باہمی تعلقات کی بنیاد، اصولی حیثیت، اہمیت اور گہرائی ظاہر کرنے کے لیے یہ بالکل کافی ہے اور اس معاملے میں اسے ایک اسلامی تحریک کے چارٹر کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

اس سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی تحریک میں افراد کا باہم دگر رشتہ ایک اصولی رشتہ ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ اور فکر کی یگانگت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اور نصب العین کی یکسانیت اس کی بنیاد بنتی ہے یعنی یہ ایمان کا اشتراک ہوتا ہے جو اس میں رنگ بھرتا ہے اور دوسری طرف یہ کہ اصولی رشتہ ہونے کی بنا پر یہ کوئی روکھا سوکھا رشتہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں جو استحکام، گہرائی اور شدید محبت ہوتی

ہوتی ہے اس کو صرف دو بھائیوں کا باہمی تعلق ہی ظاہر کرسکتا ہے اور یہی تعلق ہے جو اخوت کہلاتا ہے۔ ایک اصولی رشتے کو اسلام جو وسعت و استحکام اور جذبات بخشتا ہے اس کی ترجمانی کے لیے "اخوۃ" سے بہتر اور کیا لفظ ہو سکتا تھا۔

اسلامی تہذیب میں ایمان کا تصور صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ انسان چند مابعد الطبعی حقائق کا اقرار کرلے اور بس۔ بلکہ یہ ایک ہمہ گیر حیثیت کا حامل ہے۔ یہ ایک عقیدہ ہے جو قلب پر چھا جاتا ہے اور رگوں میں خون کی طرح گردش کرنے لگتا ہے۔ ایک جذبہ ہے جو سینہ کو مضطرب و متلاطم رکھتا ہے۔ ایک فکر ہے جو ذہن و دماغ کا سانچہ ہی بدل دیتا ہے۔ ایک عملی نظام کی قوت نافذہ ہے جو تمام اعضا و جوارح کو اپنے تسلط میں لے کر پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انقلاب لے آتی ہے جو ایمان اتنا وسیع الاثر ہو اس کی گرفت سے انسانوں کے باہمی تعلقات کس طرح آزاد ہو سکتے ہیں جب کہ یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پوری زندگی سوائے ایک بہت معمولی جزو کے عبارت ہے انسان اور انسان کے باہمی تعلقات سے۔ اس لیے یہ ایمان اپنے ماننے والوں کو تمام انسانوں سے عموماً اور ایک دوسرے سے خصوصاً تعلقات قائم کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور پھر ایک طرف ان تعلقات کو عدل و احسان کی بنیاد پر قائم کرنے کے لیے وہ ایک اجتماعی نظام حیات اور ایک تہذیب کی صورت گری کرتا ہے اور دوسری طرف حقوق و فضائل پر مشتمل ایک ضابطہ تجویز کرکے دیتا ہے تاکہ ہر فرد اپنے اپنے مقام پر اس کو عمل میں لائے اور اس طرح جو لوگ رشتۂ ایمان میں منسلک ہوں وہ ایک دوسرے سے اس طرح جڑ جائیں جیسے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ سے جڑ جاتی ہیں۔ یا جس طرح ایک بھائی دوسرے بھائی سے جڑا ہوتا ہے۔ اور یہ اس ایمان کی اصولی حیثیت کا لازمی تقاضا ہے جس کے لیے انسانی فطرت مطالبہ کرتی ہے اور جس پر عقل شہادت دیتی ہے۔

جو لوگ ہر رنگ اتار کر صرف اللہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، تمام اطاعتیں ترک کرکے صرف اللہ کی اطاعت کرتے ہیں ہر باطل سے کٹ کر صرف حق سے جڑ جاتے ہیں اور صرف اللہ کے لیے یکسو ہو جاتے ہیں وہ بھی اگر ایک دوسرے سے مربوط نہ ہوں گے، متعلق نہ ہوں گے اور محبت کے تعلقات قائم نہ کریں گے تو پھر کون کرے گا۔ نصب العین کے لیے یکسوئی سے زیادہ بڑی کون سی قوت ہے جو انسان کو انسان سے

جوڑ سکتی ہو۔ اس یکسوئی کا ایک ایک تقاضا اور راہِ حق کی ایک ایک منزل اس تعلق کو ایک زندہ حقیقت میں تبدیل کرتی چلی جاتی ہے۔ جو آدمی صرف حق کے لیے خود کو وقف کر دے پھر وہ اس راہ پر چلنے والوں میں سے ایک ایک کی محبت، ہمدردی، تسلّی اور سہارے کا ضرورت مند اور محتاج ہوتا ہے اور اگر اس راستے پر اسے یہ نعمت بھی نہ ملے تو یہ اتنی بڑی کمی ہوگی کہ جس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگی۔

اس دنیا میں ایمان کا اصل مقصد — یعنی عالمگیر اسلامی انقلاب اور اسلامی تہذیب کا قیام خود ایک انتہائی مستحکم اور برادرانہ تعلق کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مقصد کا حصول کوئی آسان کام نہیں یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ جہاں قدم قدم پر مصائب کی آندھیاں اٹھتی ہیں اور آزمائشوں کے سیلاب آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس گراں بار ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ایک ایک فرد کی رفاقت انتہائی قیمتی ہے جس کا فقدان کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم ہو کہ قلتِ اعوان و انصار اس راہ کا ایک کلیہ ہے۔

پھر کوئی اجتماعی انقلاب بغیر ایک منظم اور طاقت ور جماعت کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتا اور ایک منظم اور طاقت ور جماعت اس وقت وجود میں آتی ہے جب اس کے افراد ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں جب ہی اس مقصد کے لیے اتنے منظم طریقے پر جدوجہد کی جا سکتی ہے جیسے کوئی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ (کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ) جس میں کسی رخنہ اور انتشار کو راہ نہ ملے۔ اور ایسی منظم جدوجہد ہی کامیابی کی ضامن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ایک نوزائیدہ اسلامی ریاست کے چلانے والوں کو اس ربط کی ہدایت اس طرح کی ہے:۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

سورۂ انفال کے آخر میں اسلامی انقلاب کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو اس کے لیے ایک لازمی شرط کے طور پر سامنے رکھا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ اس دین پر ایمان لائیں اس کی خاطر ہر چیز ترک کر دیں اور اس جدوجہد میں اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دیں ان کا رشتہ ایک دوسرے کے

ساتھ لازماً دوستی و محبت کا رشتہ ہے اور اس رشتے کے لیے یہاں ولایت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (انفال)

اور اس سے آگے چل کر کفار کی تنظیم، اشتراک اور ان کی جماعتی قوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں نے یہ رشتہ ولایت پیدا نہ کیا تو عدل و احسان اور خدا پرستی کی بنیاد پر ایک عالم گیر اسلامی انقلاب کی تمنا کبھی ٹھوس زمین پر جڑ نہ پکڑ سکے گی اور نتیجۃً خدا کی یہ زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے گی کیونکہ مسلمان بغیر اس رشتہ ولایت کے انقلاب کی مخالف طاقتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (انفال)

اور ظاہر ہے کہ اسلامی تہذیب کے قیام اور اسلامی انقلاب کے لیے یہ جدوجہد ہی ایمان کا اصل معیار ہے:-

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (انفال)

اور اس کے کچھ ہی پیشتر اللہ تعالیٰ نے مخالفین کی تدابیر کے مقابلے میں اپنی نصرت کے وعدہ کے ساتھ ساتھ جس چیز سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈھارس بندھائی ہے وہ مومنین کی جماعت ہے کہ جس کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑ دیا ہے اور جو اسلامی انقلاب کی ضمانت ہے۔

هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ (انفال)

اسلامی انقلاب کے داعیوں کا یہ باہمی تعلق اخوت کا تعلق ہے، ولایت کا تعلق ہے، رحمت کا تعلق ہے اور محبت کا تعلق ہے لیکن اخوت کا لفظ بڑا ہمہ گیر ہے جو اپنے دامن میں سب کچھ سمیٹ لیتا ہے۔ اسلامی تحریک کے کارکنوں کو آپس میں اس طرح جڑنا چاہیے جس طرح دو بھائی جڑے ہوتے ہیں جس طرح

دو بھائیوں کا رشتہ ایک ناقابلِ شکست رشتہ ہوتا ہے اور وہ اپنے درمیان کوئی اختلاف، تفرقہ، فساد یا
انتشار برداشت نہیں کر سکتے۔ جس طرح وہ ایک دوسرے کے لیے اپنا سب کچھ نثار کر دینے کے لیے تیار
ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی اعانت اور مدد میں لگے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے
پشت پناہ اور سہارا بنتے ہیں۔ جس طرح وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور اپنے
معاملات میں پورے اعتماد کے ساتھ ایک دوسرے کو شریک کرتے ہیں اور جس طرح ان کے درمیان
ایک شدید جذبۂ محبت ہوتا ہے جو ان کے سینوں میں موج زن رہتا ہے اور ان کے دلوں کو حرارت
بخشتا ہے ٹھیک اسی طرح راہِ حق کے ان مسافروں کا تعلق ہوتا ہے جو دین کے لیے اپنا پورا سرمایۂ زندگی
لگا دیتے ہیں۔ جسے اسلامی انقلاب سے جتنی گہری لگن ہو گی وہ اتنا ہی گہرا تعلق اپنے ساتھی سے قائم کرے گا
اور جسے جتنا زیادہ یہ مقصد عزیز ہو گا اسے اتنا ہی یہ تعلق عزیز ہو گا۔ کیونکہ یہ تعلق خالصۃً للہ اور فی اللہ ہوتا
ہے۔ صرف اللہ کے لیے اور صرف اللہ کی راہ میں جو شخص اسلامی انقلاب کا سرگرم داعی ہو اور پھر اس کا
تعلق اپنے ساتھیوں سے ایسا ہو جیسا راہ چلتے اجنبی سے تو اسے اپنے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ وہ کس
راہ پر جا رہا ہے اور اگر اسے اپنے ان ساتھیوں سے تعلق کی بس اتنی ہی قدر ہو جتنی اس گرد کی جو آدمی اپنے اوپر
سے جھاڑ دیتا ہے تو پھر اسے سوچنا پڑے گا کہ اس کے دل میں خود اس مقصد کی کتنی قدر ہے جس کی محبت کا وہ
دعویٰ کرتا ہے۔

اخوت کا یہ وہ تعلق ہے جس کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الحُبُّ لِلّٰہ" کی پاکیزہ جامع اور قلب
کو مسخر کر دینے والی اصطلاح استعمال کی ہے۔ محبت خود ایک بڑی پرکشش اور شیریں اصطلاح ہے۔
اور پھر للہ اور فی اللہ کی قید اسے تمام آلودگیوں اور ناگواریوں سے پاک کر کے رفعت کے انتہائی درجات
تک پہنچا دیتی ہے۔ اور اس طرح یہ اصطلاح بیک وقت عقل اور دل کو وہ پیمانہ دیتی ہے جس پر ہر مومن
اپنے تعلق کو ناپ سکتا ہے۔

اللہ پر ایمان کا اور اس کی راہ میں محبت کا بالکل لازم و ملزوم کا سا تعلق ہے۔ جہاں ایک چیز ہو گی،
وہاں دوسری بھی موجود ہو گی۔ ایک نہ ہو گی تو دوسری بھی مشکوک ہو گی۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ایک جگہ اس کا اظہار یوں کیا کہ:۔

لَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا	تم اُس وقت تک مومن نہ ہوگے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔

(عن ابی ھریرۃ فی المسلم۔ بحوالہ م ۳۹۷)

اور پھر پورے تعلقات کو اس بنیاد پر قائم کرنے اور اپنی محبت اور دشمنی کو اللہ کے لیے خالص کر لینے کو تکمیلِ ایمان کی شرط ٹھیرایا:۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ	جس نے محبت کی تو صرف اللہ کے لیے اور دشمنی کی تو صرف اللہ کے لیے، کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لیے اور روکا تو اللہ کے لیے اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

دوستیاں اور دشمنیاں انسان کی زندگی پر واقعی اس طرح اثر انداز ہوتی ہیں کہ ان کا اللہ کے لیے خالص کر لینا تکمیلِ ایمان کے لیے اگر ضروری شرط ٹھیرایا گیا ہے تو بالکل منطقی اور بدیہی بات ہے۔ ایمان کی بہت ساری شاخیں ہیں ہر شاخ اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے۔ اللہ کے لیے محبت ایک معاشرہ کے استحکام اور حسن وجمال کے لیے اور اسلامی انقلاب کے لیے ایک منظم طاقت بروئے کار لانے کے لیے جس طرح ضروری ہے اس کے پیشِ نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک جگہ تمام اعمال سے افضل قرار دیا۔

حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ:۔

خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی قَالَ قَائِلٌ الصَّلٰوۃُ وَالزَّکٰوۃُ وَقَالَ قَائِلٌ الْجِھَادُ۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ	ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اور پوچھا کیا جانتے ہو اعمال میں سے کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ کسی نے نماز و زکوٰۃ کو کہا اور کسی نے جہاد کو۔ آپ نے فرمایا کہ صرف اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے دشمنی، اللہ کے نزدیک تمام اعمال میں محبوب ترین ہے۔

(ابی داؤد)

پھر ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے آپؐ نے سوال کیا کہ :-

ای عُرَی الایمان اوثق ـ قال اللہ و رسولہ اعلم ـ قال الموالاۃ فی اللہ و الحب للہ و البغض للہ ـ (بیہقی)

ایمان کی کون سی کڑی مضبوط ترین ہے؟ جواب دیا کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے کہا اللہ کی راہ میں دوستی اور اس کی راہ میں محبت و دشمنی۔

عُرٰی حلقہ کو بھی کہتے ہیں اور اس درخت کو بھی جس کے پتے خزاں میں نہیں جھڑتے اور برتنوں کے دستہ کو بھی کہتے ہیں جس کو پکڑ کر برتن اٹھایا جاتا ہے۔ یعنی یہ اللہ کی راہ میں محبت وہ مضبوط سہارا ہے جس کے بل پر آدمی ایمان کے تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ ایسا سہارا جو کبھی نہ ٹوٹ سکتا ہے اور نہ دھوکا دے سکتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایمان آدمی کی پوری زندگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یعنی زندگی کا ہر لمحہ اس وقت تک جب تک کہ جسم میں سانس آ رہا ہے اور جا رہا ہے ایمان کے تقاضوں کے مطابق گذرنا چاہیے۔ زندگی میں اتنی وسعت کے ساتھ عمل صالح اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہو سکتا جب تک کہ مومن کے تعلقات اللہ کے لیے محبت کے تعلقات نہ ہوں، اس لیے بھی کہ تعلقات آدمی کی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ یہ تعلقات اس کی زندگی کو لازماً متاثر کرتے ہیں اور ایک طرح اس کی دوستیاں اس کے دین کا معیار بن جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنے نفس و ذات کو ان لوگوں کے ساتھ باندھیں جن کی زندگیوں میں خدا کی یاد رچی بسی ہوئی ہو۔ اور اس کے لیے صبر کا لفظ استعمال کرتا ہے تاکہ وہ حق کی راہ پر چل سکیں اور ساتھ ہی اپنی نظروں کو دنیوی ساز و سامان اور آرائش سے متاثر ہو کر بھٹکنے نہ دیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (کہف ۲۸)

اور اپنی ذات کو ان لوگوں کے ساتھ ٹھیراؤ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ اس کی خوشنودی کے طالب ہیں اور دنیوی زندگی کی زینت کی خواستگاری میں تمہاری نگاہیں ان سے ہٹ کر ادھر نہ دوڑیں۔

اور دوسری طرف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم متنبہ کرتے ہیں کہ انسان اپنی دوستی کے تعلقات سوچ سمجھ کر قائم کرے اس لیے کہ :۔

اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ یُّخَالِلُ — آدمی اپنے خلیل کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک سوچ سمجھ لے کہ وہ اپنا خلیل کس کو بناتا ہے۔

(احمد و ترمذی و ابوداؤد و بیہقی) (عن ابی ہریرۃ رض)

خلیل کا لفظ خُلّت سے نکلا ہے جس سے مراد ایسی محبت اور خلوص ہے جو دل میں اتر کر رچ بس جائے۔ اچھے اور بُرے لوگوں کی محبت اور صحبت کی ایک عمدہ تمثیل حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اچھی صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی عطر فروش کی ہم نشینی کی جائے۔ اگر عطر نہ بھی ملے تب بھی خوشبو سے تو دل و دماغ ترو تازہ ہوگا۔ اور بُری صحبت کو لوہار کی دکان سے تشبیہ دی گئی ہے، جس میں اگر کپڑے جلنے سے بچ گئے، تب بھی کالک اور دھواں تو طبیعت کو پراگندہ کرے گا ہی۔

ایمان کا ایک اسٹیج وہ ہوتا ہے جب آدمی خود ایمان اور ایمان کے عملی مطالبات کی ادائیگی میں بھی ایک خاص لذت اور کیف و سرور محسوس کرتا ہے اور پھر عمل صالح کا مطالبہ اس لذت کی وجہ سے آدمی کے اندر سے اٹھتا ہے۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلاوتِ ایمان سے تعبیر کیا ہے اور اس کی تین شرائط بیان کرتے ہوئے اس میں ایک چیز یہ بھی رکھی ہے کہ :۔

اَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ — کہ وہ آدمی سے محبت کرے اور یہ محبت سوائے اللہ کے کسی اور کے لیے نہ ہو۔

ایک غلام اور بندہ کو اپنے آقا و مالک کی محبت اگر نصیب ہو جائے تو اس سے بڑھ کر اس کی اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

ایک مومن کو اگر اللہ کی محبت مل جائے تو اس کی اس دولت کا بدل اس کو کیا مل سکتا ہے۔ یہ وہ محبت ہے جو ایک مومن کی معراج ہوتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو بتاتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے تعلقاتِ اخوت قائم کریں وہ اس نعمتِ عظمیٰ کے مستحق ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رض

یہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول قال اللّٰہ تعالیٰ وجبت محبتی للمتحابین فی والمتجالسین فی والمتزاورین فی والمتباذلین فی۔	میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہوگی جو میرے لیے آپس میں محبت کریں، ساتھ مل کر بیٹھیں، ایک دوسرے سے ملنے جائیں اور ایک دوسرے پر مال خرچ کریں۔

دنیوی زندگی میں تو اللہ کے لیے محبت کے یہ سب کچھ نتائج ہیں ہی لیکن آخرت میں جب آدمی کے لیے ایک ایک عمل قیمتی ہوگا اور ایک کھجور کا صدقہ اور ایک اچھی بات بھی اس کے لیے بڑا غنیمت ہے اس وقت یہ تعلق ایک مومن کے لیے انتہائی بلند درجات کا موجب ہوگا اور اسلامی انقلاب کے ضمن میں اس تعلق کی اہمیت پر جو کچھ ہمیں معلوم ہے اس کے پیش نظر یہ بالکل فطری اور لازمی بات ہے۔

اُس دن کسی آدمی کو دوسرے کا ہوش نہ ہوگا۔ آدمی اپنے ماں باپ بھائی بہن بیوی بچے سب سے دور بھاگے گا۔ آگ سے بچنے کی خاطر ان سب کو فدیہ میں دیدینے کو تیار ہوگا، دوستی کی تمام حقیقتیں کھل جائیں گی اور دوست دوست کا دشمن ہو جائے گا۔ وہی دوست جن کی محبتیں دنیا میں دل و دماغ میں سرایت کیے ہوئے تھیں۔ لیکن صرف متقین ہوں گے جن کی دوستیاں وہاں قائم رہیں گی اس لیے کہ اس نازک مرحلہ میں یہ معلوم ہوگا اور اس کا صحیح احساس و اندازہ ہوگا کہ دنیا میں ان دوستیوں نے کیا کچھ بخشا جو آج کام آرہا ہے۔

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ۞ یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۞	جو آپس میں ایک دوسرے کے دوست تھے اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے متقین کے۔ اے میرے بندو آج کے دن تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہوگے۔ (زخرف)

اور اس طرح آدمی کا انجام انہیں لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ اس کے محبت کے تعلقات ہوں گے۔ یہاں تک کہ خدا کے لیے محبت کرنے والوں میں اگر ایک مشرق میں رہتا ہوگا اور دوسرا

مغرب میں تو خداوند تعالیٰ ان کو قیامت کے دن جمع کر کے کہے گا وہ شخص یہ ہے جس سے تو محبت رکھتا تھا۔

۱۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (عن ابی موسیٰ اشعری فی البخاری والمسلم بحوالہ ص۱۸۲)

۲۔ لَوْ اَنَّ عَبْدَيْنِ تَحَابَّا فِي اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاحِدٌ فِي الْمَشْرِقِ وَ اٰخَرُ فِي الْمَغْرِبِ لَجَمَعَ اللهُ بَيْنَهُمَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَقُوْلُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتَ تُحِبُّهٗ فِيَّ۔

وہ دن ایسا دن ہوگا جب قدموں تلے آگ اُبل رہی ہوگی اور سر کے اوپر آگ کا بادل ہوگا جس سے انگارے برس رہے ہوں گے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے سے آگ کی لپٹیں رخسار دل کو چھو رہی ہوں گی اور صرف ایک سایہ ہوگا جہاں انسان پناہ حاصل کر سکے گا اور وہ عرش الٰہی کا سایہ ہوگا۔ جو سات قسم کے آدمی اس دن اس سائے میں ہوں گے اُن کے بارے میں اللہ کے رسولؐ نے ہم کو خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ ان میں :۔

رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَ تَفَرَّقَا عَلَيْهِ (رواہ ابوہریرہؓ فی البخاری والمسلم بحوالہ ص۱۹۰)	دو آدمی وہ ہوں گے جنہوں نے اللہ کے لیے آپس میں محبت کی اس کے لیے جمع ہوئے اور اس کے لیے علیحدہ ہوئے۔

اور ان پر خدا کی رحمت ہو کہ انہوں نے ہم تک اللہ کا یہ فرمان بھی پہونچایا کہ :۔

اِنَّ اللهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ فِيَّ ؟ بِجَلَالِيْ اَلْيَوْمَ اُظِلُّهُمْ فِيْ ظِلِّيْ۔ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّيْ۔ (عن ابی ہریرۃ فی المسلم بحوالہ ص۲۲۵)	اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا کہاں ہیں وہ جو میری عظمت کی وجہ سے آپس میں محبت کرتے تھے۔ آج کے دن میں انہیں اپنے سائے میں جگہ دوں گا، اور آج کے دن سوائے میرے سائے کے کوئی سایہ نہیں ہے۔

اور ان کے لیے وہ کیا ہی بلند درجات ہوں گے جن کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے یوں دی ہے کہ :۔

اَلْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیْ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ یَغْبِطُهُمُ النَّبِیُّوْنَ وَ الشُّهَدَاءُ	جو میری عظمت کی خاطر آپس میں محبت کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں نور کے منبر ہوں گے اور انبیاء و شہداء ان پر رشک کریں گے۔

(عن معاذ بن جبل فی الترمذی ص۴۳۶)

اللہ کے لیے اور ایمان کی بنیاد پر باہم یہ گہرے مستحکم اور محبت کے جذبات سے لبریز تعلقات اسلامی تحریک کے لیے اتنے اہم ہیں کہ ان کی خرابی کو انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ انقطاعِ تعلق کے بارے میں جو سخت تنبیہات آئی ہیں، باہم صلح کرنے اور کرانے کے لیے جو وعدے آئے ہیں اور تعلقات خراب کرنے والوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر تفصیلی گفتگو تو آگے آئے گی لیکن یہ بات ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی تعلقات کی خرابی اور بُغض کو ایک ایسے اُسترے سے تشبیہ دی ہے جو پورے دین کو مونڈ کر صاف کر دے .... هِیَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ (عن ابی درداء فی احمد و ترمذی ص۴۲۵) (م)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلق کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہوتے ہیں جو لوگ بھی خلوص دل سے اس دین سے منسلک ہوں گے اُن کے قلب سے اپنے ساتھیوں کے لیے لازماً محبت کے چشمے اُبلنے لگیں گے اور یہ تعلق انہیں اتنا عزیز ہوگا اور ان کے سینوں میں اس کی اتنی قدر و قیمت ہوگی کہ وہ کوئی نقصان بھی برداشت کرلیں لیکن اس کا زیان برداشت نہ کریں گے۔

اسلامی تحریک کے کارکنوں کا یہ باہمی محبت الفت اور پیار کا تعلق وہ تعلق ہے جسے اللہ تعالےٰ نے اپنے عظیم ترین انعامات میں سے شمار کیا ہے اور جس اسلامی جماعت کو یہ نعمت مل جائے اس پر اس کا بڑا خاص فضل و کرم ہے۔ کیونکہ یہ تعلق ہی جماعت کی زندگی اور حرارت کا ضامن ہے اور افراد کو وہ ماحول دیتا ہے جس میں وہ ایک دوسرے کا سہارا بن کر راہِ حق کی منزلیں طے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیکی کی راہ پر چلانے کے لیے مستقل کوشاں رہتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ کی اسلامی جماعت کو اللہ تعالیٰ نے باہمی اتحاد و محبت اور اخوت کی جو عظیم دولت بخشی تھی اس کی یاد دہانی سورۂ آل عمران میں کی گئی ہے اور اسکو

اپنی نعمت بنایا گیا ہے :-

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ	اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب تم آپس
كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ	میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا	اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے ۔

(آل عمران - ۱۰۳)

پھر سورۂ انفال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ روئے زمین کی ساری دولت خرچ کرنے کے بعد بھی یہ آپؐ کے بس کی بات نہ تھی کہ آپ مسلمانوں کے دلوں کو اس طرح الفت ومحبت کے رشتے میں جوڑ دیتے یہ صرف اللہ کی قدرت ہے کہ اس نے ایسا کیا اور وہی ایسا کر سکتا تھا اس نے ایک دین دیا اور اس دین پر ایمان اور اس دین سے محبت کی توفیق دی اور اس کا نتیجہ ہے یہ پیار و محبت۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ (انفال - ۶۳)

حصہ دوم

سیرت کی بنیادی خصوصیات

باہمی تعلقات کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا ہے، اسے قائم اور برقرار رکھنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے حقوق وفضائل کا ایک ضابطہ بھی تجویز کر کے دیا ہے۔ اس ضابطہ پر عمل کر کے ان تعلقات کو بآسانی دین کے مطلوبہ معیار پر پہونچایا جا سکتا ہے لیکن اس ضابطہ کی اساس چند بنیادی امور پر قائم ہے جنہیں اگر انسان اپنی سیرت میں اختیار کرے تو ان حقوق و فضائل میں سے ایک ایک چیز ان بنیادی صفات کے منطقی نتیجہ کے طور پر ظہور پذیر ہوتی چلی جائے گی۔ یا یوں کہیے کہ پھر یہ صفات آدمی کے اندر سے ایک ایک حق کو

ادا کرنے اور ایک ایک فضیلت کو اختیار کرنے کے لیے تقاضا اور مطالبہ کریں گی اور پھر قدم قدم پر نصیحت یا تنبیہ کی ضرورت نہ پڑے گی۔

سب سے پہلی اور بنیادی چیز خیر خواہی ہے۔

خیر خواہی خیر خواہی کے لیے احادیث میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ "نصیحت" ہے اور یہ لفظ اپنے دامن میں بڑے وسیع معانی سمیٹ لیتا ہے۔ اسی لیے زبانِ رسالت نے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ:۔

اَلدِّینُ نَصِیْحَۃٌ (ثلاثاً) دین سراسر خیر خواہی ہے (تین بار) (مسلم، م ۴۳۳)

پھر مزید تشریح کے طور پر ان کے نام شمار کرائے گئے جن کے ساتھ خیر خواہی مطلوب ہے اور ان میں عامۃ المسلمین کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ آپؐ نے اپنے کچھ ساتھیوں سے عام مسلمانوں کے لیے خیر خواہی (نصیحت) کی بیعت لی۔ لغوی معانی کی روشنی میں اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ تعلق میں کھوٹ نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس صفت کو اس طرح متعین کر سکتے ہیں کہ آدمی کے اوپر ہمیشہ اپنے بھائی کی بھلائی و بہتری کی فکر ہی غالب رہے۔ اسی کی بہتری کے لیے سرگردان ہو۔ اور ہر پہلو سے اس کو فائدہ پہونچانے کی کوشش کرے۔ اس کا کوئی نقصان کوئی تکلیف گوارا نہ ہو اور دنیوی یا دینی جس پہلو سے اس کو مدد پہونچا سکتا ہو اس کی کوشش کرے۔ اس خیر خواہی کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اس لیے کہ آدمی خود کبھی اپنی ذات اور اپنے نفس کا بُرا نہیں چاہ سکتا بلکہ وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ نفع، بھلائی اور بہتری کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کے حقوق میں کمی نہیں گوارا کر سکتا۔ وہ اس کے فائدہ کے لیے مال اور وقت خرچ کرنے میں دریغ نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی برائی نہیں سُن سکتا۔ وہ اس کی بے عزتی گوارا نہیں کر سکتا اور وہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ رعایت کا طالب ہوتا ہے بس خیر خواہی کے معنی یہی ہیں کہ آدمی کی سیرت میں یہ صفت پیدا ہو جائے اور اس کا رویہ اس طرز پر نشو و نما پائے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

مومن کے کردار کی اس صفت کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی ایک لازمی شرط ٹھیرایا ہے

اور فرمایا ہے کہ :۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

پھر اسی طرح ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو چھ اہم حقوق بتائے گئے ہیں ان میں اس خیر خواہی کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :۔

.... وَیَنْصَحُ لَہٗ اِذَا غَابَ اَوْ شَہِدَ ....

.... کہ وہ اپنے بھائی کی خیر خواہی کرے خواہ وہ غائب ہو یا موجود ہو ....

اور دوسری حدیث میں یہی بات یوں کہی گئی ہے کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ :۔

وَیُحِبُّ لَہٗ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

وہ اس کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ خیر خواہی کی یہ صفت اپنے دامن میں کتنے حقوق و فضائل سمیٹ لیتی ہے جو براہ راست اس کے لازمی تقاضے کے طور پر وجود میں آتے ہیں۔

(باقی)

اسلامی ریاست

اسلامی معاشرہ اور اسلامی قومیت

(۲)

اسلام میں قومیت کی اساس اوپر یہ بات وضاحت سے ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام قومیت کے معروف عوامل میں سے کسی عامل کو بھی بے داغ اور مفاسد سے پاک تسلیم نہیں کرتا اس وجہ سے ان میں سے کسی کو بھی یہ درجہ نہیں دیتا کہ اس پر معاشرت اور تمدن کی بنیاد رکھ دی جائے اور اس کو ایک سیاسی نظام کے لیے اساس کار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان عوامل میں سے کسی عامل کو بھی اسلام میں یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ وہ قومیت کی بنیاد بن سکے تو آخر اسلام میں قومیت کی بنیاد ہے کیا چیز؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد خود اسلام ہے۔ جو شخص اسلام کو قبول کر لیتا ہے وہ اسلامی قومیت کا ایک جزو بن جاتا ہے، جو شخص اسلام کو قبول نہیں کرتا وہ اسلامی قومیت کا جزو نہیں بن سکتا۔

یہ حقیقت اگرچہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، لیکن قومیت کے جدید نظریات اب دماغوں پر اس طرح مسلط ہو چکے ہیں کہ اور تو اور خود مسلمان بھی اب اس بات میں شک کرنے لگے ہیں کہ اسلام میں قومیت کی اساس خود اسلام ہی ہے، جب تک کوئی شخص کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کرے اس وقت تک اس کو اسلامی قومیت میں بحیثیت ایک شریک مساوی کے شامل ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ عرب قوم جس کو خدا کے اس آخری دین کے حامل اول ہونے کا شرف حاصل ہوا، سب سے پہلے دنیا میں اس حقیقت کا

اعلان کرنے والی یہی تھی کہ اسلام میں قومیت کی اساس اسلام کے اصول و عقائد ہیں نہ کہ نسل یا زبان یا وطن یا اس طرح کی کوئی اور چیز۔ اسلام اپنے عقلی اور فطری اصولوں کے سوا کسی چیز کا بھی یہ درجہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ انسان اور انسان کے درمیان کسی فرق و اختلاف کی بنیاد بن سکے لیکن اب اسی قوم کے اندر یہ تحریک اٹھ رہی ہے کہ عربی نسل اور عربی زبان کو عربی قومیت کی بنیاد ہونا چاہیے ان کے سوا کسی چیز کو بھی یہ اہمیت حاصل نہیں ہونی چاہیے کہ وہ عربی زبان بولنے والوں کے درمیان قومیت کا کوئی فرق پیدا کر سکے۔

یہ صورت حال تقاضا کر رہی ہے کہ ہم اصل حقیقت واضح کرنے کے لیے یہاں کچھ دلائل بھی پیش کریں اور ضروری ہے کہ یہ دلیلیں نقلی اور عقلی دونوں طرح کی ہوں تاکہ مسلمان بھی ان سے مطمئن ہو سکیں اور ان لوگوں کے شبہات بھی دور ہو سکیں جو مذہب کو خواہ وہ کوئی بھی ہو، قومیت کی اساس ماننے میں طرح طرح کے خطرے محسوس کرتے ہیں۔

قومیت کے معاملے میں انبیاء علیہم السلام کا عمل قومیت کے معاملے میں نہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلکہ تمام انبیاء کا عمل ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم تک کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ اس حقیقت کو بالکل غیر مبہم طور پر واضح کر رہی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء کرام نسل، نسب اور زبان اور وطن سے بنی ہوئی قومیتوں ہی کے اندر سے اٹھے تاہم انہوں نے اس قومیت کو کبھی جایز تسلیم نہیں کیا۔ جایز تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جن عوامل سے اس قومیت کی تشکیل ہوتی ہے ان عوامل کے فطری حقوق بھی انہوں نے تسلیم نہیں کیے، جہاں تک ان کے فطری حقوق اور مطالبات کا تعلق ہے ان کو نہ صرف یہ کہ انہوں نے تسلیم کیا بلکہ دوسروں سے کہیں زیادہ تسلیم کیا، اپنے ہم نسبوں اور ہم وطنوں کے لیے ایک شخص کے دل میں جو محبت و ہمدردی ہونی چاہیے وہ انبیاء علیہم السلام کے دل میں سب سے زیادہ تھی، وہ اپنی اپنی قوموں کے سب سے زیادہ خیر خواہ اور سب سے زیادہ غم خوار تھے اور ہمیشہ اپنی قوم کو "اے میری قوم" کے محبت بھرے خطاب سے خطاب کرتے تھے تاہم کسی نبی نے بھی اپنی قوم کے بارے میں یہ

اعلان نہیں کیا کہ فلاں نسل و نسب کے لوگ ایک قوم ہیں اس وجہ سے ان کے درمیان کسی عقیدہ یا نظریہ کی بنا پر کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے یا فلاں زبان بولنے والے سب ایک قوم ہیں اس وجہ سے انہیں لسانی بنیاد پر دوسروں کے مقابل میں اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے یا فلاں پہاڑ سے لے کر فلاں دریا تک کے سارے بسنے والے ایک متحدہ قومیت کے اجزاء ہیں جو شخص ان کے درمیان عقیدہ یا مسلک کی بنا پر کوئی فرق پیدا کرتا ہے وہ انتشار پسند ہے۔ اس طرح کی کوئی بات ہمیں کسی نبی سے بھی منقول نہیں ملتی اور نہ کسی نبی نے کبھی یہ کہا کہ " میں اپنی قوم کا ساتھی ہوں خواہ میری قوم حق پر ہو یا باطل پر۔

ایک قوم کو اپنے بزرگوں سے، اپنی زبان سے اور اپنی نسل سے جو وابستگی ہوتی ہے اور اس کی بنا پر قوم کے ہر فرد کے اندر ان کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں سے جو محبت ہو جاتی ہے یا ہونی چاہیے انبیاء علیہم السلام اس سے اچھی طرح باخبر تھے اور اپنی دعوت میں انہوں نے اس فطری اپیل سے فایدہ بھی اٹھایا ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں کہ اگر ایک چیز عقل اور فطرت کے اعتبار سے حق ہوئی ہے اور حسن اتفاق سے اس کے پیچھے کوئی اس طرح کی تاریخ بھی ہوئی ہے تو انہوں نے اس سے فائدہ اٹھالیا ہے اس نسبت کو بجائے خود کسی چیز کے حق ہونے کی بنیاد تسلیم نہیں کیا ہے۔ مثلاً اسلام کے متعلق قرآن نے عربوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ تمہارے جد امجد حضرت ابراہیم ؑ کا دین ہے (مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ یہ تمہاری اپنی قوم کے اندر سے اٹھے ہیں یا امیوں کے اندر سے اٹھے ہیں یا خود قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ باتیں اسی مقصد سے کہی گئی ہیں کہ عربوں کو اس ملت، اس پیغمبر اور اس قرآن کی طرف راغب کیا جائے لیکن محض اس دلیل کی بنا پر نہیں کہ اسلام ان کے باپ کا دین ہے، یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی اپنی قوم کے ایک لیڈر ہیں یا قرآن خود ان کے ادب کا ایک شاہکار ہے بلکہ ان کی حقانیت کے نہایت واضح اور قطعی دلایل قرآن میں الگ بیان

ہوئے ہیں اور یہ دلائل تمام تر عقلی اور فطری ہیں، اِن عقلی و فطری دلائل پر مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ جہاں تک عربوں کا تعلق ہے انہیں ان چیزوں سے قومی تعلق کی بنا پر بھی لگاؤ ہونا چاہیے۔

صرف یہی نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے نسل و نسب یا زبان اور وطن کے نعرہ پر لوگوں کو متحد اور منظم ہونے کی دعوت نہیں دی بلکہ ان اساسات پر قایم شدہ تنظیموں کو انہوں نے توڑا اور توڑ کر از سر نو ان کو ایمان اور عقیدہ کی بنیاد پر قایم کرنے کی دعوت دی اور اگر ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی اپنی قوموں کو چھوڑ کر اور ان سے اعلان براءت کر کے الگ ہو گئے ہیں اور جس سرزمین پر بھی ان کو ایمان اور عقیدہ کی بنیاد پر ایک ملی تنظیم کے مواقع حاصل ہوئے ہیں انہوں نے وہاں اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کی ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت یوں تو ہر نبی کی زندگی سے فراہم ہوتا ہے لیکن ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف تین جلیل القدر انبیاء...... حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہم وسلم کی زندگی سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اسوہ | حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ قرآن میں یوں نقل ہوئی ہے۔

> "اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے خدا کی طرف سے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اور یہ دعوت دیتا ہوں کہ اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی سے ڈرو اور میری بات مانو۔"
>
> (۲-۳، نوح)

یہ دعوت جس دل سوزی، جس سرگرمی اور جس جوش سے انہوں نے دی اور ان کی قوم نے اس دعوت کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی تصویر خود انہی نے اس طرح کھینچی ہے:۔

> "اس نے دعا کی کہ اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات دن پکارا مگر میری دعوت نے ان کے گریز ہی میں اضافہ کیا۔ میں نے جب ان کو مغفرت کی دعوت دی تاکہ تو انہیں بخشے انہوں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں، اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹ لیں اور ضد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کیا۔ پھر میں نے ان کو

کھل کر پکارا۔ پھر میں نے ان کو ظاہر بھی سمجھایا اور پوشیدہ بھی سمجھایا۔ میں نے کہا کہ اپنے رب سے مغفرت مانگو، وہ بخشنے والا ہے۔" ۵ - ۱۰ سورہ نوح

قوم کے سامنے جو دعوت اس ہمدردی اور اس دل سوزی کے ساتھ پیش کی گئی جب قوم نے وہ دعوت رد کر دی تو قوم کے ساتھ حضرت نوح کی وہی محبت جو دعوت کے لفظ لفظ کے رگ و ریشہ سے ٹپک رہی ہے بیزاری اور اعلانِ برارت کی شکل میں تبدیل ہو گئی اور انہوں نے اس قوم کو ہلاک ہونے کے لیے چھوڑ دیا اور اس کی جگہ پر انہوں نے ایک الگ جمعیت بنائی جو صرف ان لوگوں پر مشتمل تھی جو خدا کو ماننے والے اور اس کے غضب سے ڈرنے والے تھے۔ یہی جمعیت بعد میں ان کی تعلیم و دعوت کی وارث بنی اور اس سے مختلف قومیں وجود میں آئیں۔

"اور نوح نے دعا کی کہ اے میرے رب تو زمین پر کافروں میں سے ایک بھی چلتا پھرتا نہ چھوڑ، اگر تو ان کو چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور یہ صرف نابکاروں اور ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔ اے میرے رب، مجھ کو بخش، میرے ماں باپ کو بخش اور ان کو بخش جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہو جائیں اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بخش اور ظالموں کے لیے تباہی کے سوا کچھ اور نہ بڑھا۔" ۲۶ - ۲۸ نوح

حضرت نوح علیہ السلام کی اِس قوم کے اندر وہ تمام عناصرِ قومیت موجود تھے جو ایک نسلی اور وطنی قومیت کے ضروری اجزا سمجھے جاتے ہیں۔ یہ واضح طور پر ایک نسل کے لوگ تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے۔ جغرافی یکجائی نے ان کا سیاسی اور معاشی مفاد بالکل مشترک بنا دیا تھا، ان کا ایک آبائی دین بھی تھا، جس میں ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر نامی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی، ان کے اندر صاحبِ مال و اولاد لیڈر بھی تھے اور سورہ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کی تمام سیاسی چالوں سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔ قومیت کے عام تصور کو اگر سامنے رکھا جائے تو ان ساری چیزوں سے یہ قوم لیس تھی جو ایک قوم کو قوم بنانے کے لیے مطلوب ہیں۔ حضرت نوح عؑ کے الفاظ صاف شہادت دے رہے ہیں کہ ان کو اپنی اس قوم سے نہایت گہری محبت بھی تھی۔ اگر ان کو محبت نہ بھی

تھی تو آخر انہوں نے اس پوری قوم کو توڑ پھوڑ کر کیوں رکھ دیا؟ اگر ان کو اپنی قوم کی ترقی قومی حیثیت سے مطلوب تھی تو اس کے لیے صحیح طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ قومیت کے انہی عوامل میں سے کسی عامل کو بھڑکاتے جن سے ان کی قوم کو جذباتی وابستگی تھی۔ آخر ان کی قوم کے قوم پرست لیڈر، وَدّ، سواع، یغوث اور یعوق کا حوالہ دے کر لوگوں کو حضرت نوح کے خلاف بھڑکاتے ہی تھے کہ یہ شخص ان مقدس قومی معبودوں کی پرستش سے تمہیں برگشتہ کرکے تمہاری قومی جمعیت کو پارہ پارہ کر رہا ہے، اسی طرح کا کوئی قومی حربہ حضرت نوح علیہ السلام بھی اپنی قوم کو بھڑکانے کے لیے استعمال کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس قسم کے کسی فتنے کا سہارا نہیں لیا بلکہ سیدھے سیدھے لوگوں کو خدا کی طرف بلایا اور جو لوگ خدا کے کلمہ پر مجتمع ہو گئے تھے ان کے سوا سب کو انہوں نے چھوڑ دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اعلان برارت اسی طرح نسل و نسب اور زبان اور وطن کے اشتراک سے بنی ہوئی ایک قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی تھی اور انہیں بھی اس قوم سے نہایت گہری محبت تھی لیکن اس محبت کے باوجود وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ ان عناصر سے بنی ہوئی کسی قوم کے اندر وہ اپنی زندگی کے دن گذارتے رہیں یا اس کے اوپر اپنی لیڈری جمانے کے خواب دیکھیں بلکہ انہوں نے اپنی اس قوم کو ان غلط بنیادوں سے ہٹا کر توحید اور خالص خدا پرستی کی بنیاد پر منظم کرنے کی کوشش کی لیکن جب قوم نے ان کی بات نہ مانی تو وہ سب کو چھوڑ کر ایک دوسری سرزمین کی طرف ہجرت کر گئے اور اپنی اولاد میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بسایا اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ ان کی نسل سے وہ اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھائے جس کی تعمیر نسل و نسب اور زبان و وطن کے بجائے خالص توحید اور خدا پرستی کی بنیاد پر ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو الفاظ فرمائے ہیں وہ قرآن مجید میں جس طرح نقل ہوئے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

"تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کے رویے میں ایک اچھی مثال ہے۔ جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بے تعلق ہیں۔ ہم نے تمہارے

دین کا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان اس وقت تک کے لیے عداوت اور دشمنی آشکارا ہو گئی جب تک تم اللہ واحد ہی پر ایمان نہ لاؤ۔" (ممتحنہ)

مذکورہ آیت میں یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف قوم کے دین بت پرستی ہی سے بے زاری کا اعلان نہیں کیا بلکہ خود قوم سے بھی کامل بے تعلقی کا اعلان کر دیا اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ان تعلقات کی بحالی کی واحد شرط یہ ہے کہ تم ایک ہی اللہ پر ایمان لاؤ۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ نہ تو کسی ایسی قومیت کا تصور رکھتے تھے جس میں دین کو بالکل خارج از بحث رکھ کر محض نسلی اور وطنی عوامل کی مدد سے ایک قومیت کا کنبہ جوڑ لیا جائے اور نہ وہ کسی غلط دین پر قومیت کی شیرازہ بندی کا کوئی تصور رکھتے تھے۔

نبی کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس قوم کے اندر ہوئی تھی وہ نسلی اور نسبی عصبیت کے اعتبار سے دنیا کی ایک ممتاز ترین قوم تھی، اس کو اپنی زبان پر بڑا فخر تھا، اس کو اپنے وطن پر بھی بڑا ناز تھا، اپنی روایات اور اپنے دین بت پرستی کے ساتھ بھی اس کو عشق تھا اور انہی عناصر سے اس کی عربی قومیت کی شیرازہ بندی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں اہل عرب کے رگ و ریشے میں اس طرح سرایت کیے ہوئے تھیں کہ ان سے اندر ان چیزوں کا سہارا لیے بغیر کسی بڑے سے بڑے لیڈر کے لیے بھی کوئی اصلاح کا کام کرنا ممکن نہ تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم سے انتہائی محبت رکھنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کا کوئی سہارا نہیں لیا بلکہ آپؐ کی دعوت کی پہلی ہی صدا عربی قومیت کے ان تمام عناصر کے لیے ایک ضرب کاری کا حکم رکھتی تھی۔

آپؐ کی قوم کا آبائی دین بت پرستی تھا اور اس دین کو ان کی شیرازہ بندی میں بڑا دخل تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اعلان کر کے سب سے پہلے اس کے باطل ہونے کا اعلان کیا۔

آپؐ کی قوم کو اپنی زبان اور اپنے نسلی شرف کا بھی بڑا گھمنڈ تھا اور اس کی قومی شیرازہ بندی میں اس چیز کو بھی بڑا دخل تھا، آپؐ نے اپنے مختلف اعلانات کے ذریعہ سے اس پندار کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اس بارے میں قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہاں چند حدیثوں کے ترجمے پیش کرتے ہیں۔

"نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ تم سب یکساں آدم کی اولاد ہو۔"

(بخاری و مسلم)

"نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ اگر فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر۔" (زاد المعاد)

"اے قوم قریش، اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا پر تمہارے گھمنڈ کو ختم کر دیا۔"

آپؐ کی قوم کو اپنے وطن سے بھی بڑا گہرا لگاؤ تھا اور ان کی شیرازہ بندی میں اس کی عظمت و محبت کو بھی بڑا دخل تھا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس وطن سے نہایت گہری محبت تھی۔ لیکن آپؐ نے اسلام کے لیے اس محبوب وطن کو چھوڑا اور یہ کہہ کر چھوڑا کہ "اے مکہ تو مجھے دنیا کی ہر جگہ سے زیادہ عزیز ہے لیکن کیا کروں تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔" یہ گویا حضورؐ کی طرف سے اس حقیقت کا ایک عملی اعلان تھا کہ وطن بڑی چیز ہے لیکن پھر بھی اس کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ایمان اور عقیدہ کو بھی اس کے تابع کر دیا جائے۔

آپؐ کی قوم کو اپنی روایات پر بھی بڑا ناز تھا اور ان روایات کو بھی ان کی قومی شیرازہ بندی میں بڑا دخل تھا۔ لیکن نبی کریمؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں تمام غلط روایات کا یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا کہ

"یاد رکھو کہ جاہلیت کے تمہارے تمام مفاخر اور خون اور مال کے تمام دعوے آج میرے ان قدموں کے نیچے ہیں۔"

نسل و نسب اور زبان اور وطن سے بنی ہوئی قومیتوں میں ساری اہمیت انہی چیزوں کو حاصل ہوتی ہے اور قوم کے ہر فرد سے یہ چاہا جاتا ہے کہ ان کی محبت کے نشے میں اس طرح سرشار رہے کہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سن سکے اور جب کبھی ان پر کوئی آنچ آتے دیکھے تو ان کی حمیت و حمایت میں مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہو جائے۔ عربی زبان میں اسی چیز کو عصبیت کہتے ہیں اور کسی قومیت کا

استحکام اسی عصبیت پر منحصر ہوتا ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عصبیت کا بھی یہ اعلان کر کے خاتمہ کر دیا کہ :-

"جو عصبیت پر مرا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصبیت کا نعرہ لگایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جو کسی عصبیت کے تحت لڑا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام اقدامات پر نسلی اور وطنی قومیت کے علم بردار برابر چراغ پا ہوتے رہے اور آپؐ کو قوم دشمنی اور انتشار پسندی کے طعنے دے دے کر اس کے برے نتائج سے آپؐ کو ڈراتے بھی رہے لیکن حضورؐ نے ان کی سنی ان سنی کر دی اور برابر ایمان و عقیدہ کی بنیاد پر ایک نئے معاشرہ کی تعمیر میں لگے رہے۔

مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت دی قریش اس کو برابر انتشار پسندی اور تخریب سے تعبیر کرتے رہے۔ اس کے بعد جب حضورؐ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسروں سے جا ملا ہے اور جو شخص اپنی قوم کو چھوڑتا ہے بالآخر اس کی جڑ کٹ کے رہتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر قریش آپؐ کو "ابتر" کہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ خدا کے لیے قوم کو چھوڑتے ہیں وہ ابتر نہیں ہوتے ابتر وہ ہوتے ہیں جو قوم کے لیے خدا کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد جب بدر کا معرکہ پیش آیا اور قریش نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دین اور عقیدہ کے سوال نے فی الواقع قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے تو ابو جہل، جو قرشی قومیت کا سب سے بڑا علم بردار تھا، یہ منظر دیکھ کر بوکھلا اٹھا اور اس نے اسی وقت للکار کے یہ دعا کی کہ "اے خدا جس نے اس قطع رحم کی بنا ڈالی ہے تو اس کو شکست دینا"۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو رحم کی پاس داری، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں نہایت پسند ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے حقوق رحم کے حقوق سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں اس وجہ سے اس نے ان لوگوں کو فتح دی جو اللہ کے دین کے لیے رحم اور نسب کے سارے روابط سے بے پروا ہو گئے تھے۔ اور ان لوگوں کو اس معرکے میں شکست ہوئی جو نسل و نسب کے تعصبات کے پیچھے خدا کو بھول بیٹھے تھے۔

الغرض اپنی قوم کی تمام مخالفتوں کے باوجود آپؐ نے ایک ایسا معاشرہ قایم کر دیا جس میں نسل اور وطن کے بجائے تمام اہمیت ایمان اور عقیدہ کو حاصل ہوئی، جس میں ایک حبشی یا ایک رومی کے لیے تو اونچی سے اونچی جگہ تھی اگر وہ اللہ کے دین کو اپنائے لیکن ایک قریشی اور ہاشمی کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں تھی اگر وہ خدا کے دین کو نہ مانے۔ ایمان اور عقیدہ کی اساس پر قایم ہونے والے اس معاشرہ میں نسلی اور وطنی عوامل کی جگہ ہجرت اور نصرت کے عوامل نے کام کیا۔ جو لوگ اپنی قوم اور اپنے وطن کے اندر اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے ان کو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر وہاں ہجرت کر جائیں جہاں کی فضا ان کے دین و ایمان کے لیے سازگار ہے اور جو لوگ اپنے دلوں کی طرح اپنے ماحول کو بھی ایمان و اسلام کے نور سے منور کر چکے تھے ان کو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے ان دینی بھائیوں کی ہر طرح مدد کریں جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئیں۔ ہجرت کرنے والوں نے اپنے عزیزوں رشتہ داروں اور اپنے اس وطن کو چھوڑا جس کے اندر وہ اپنے دین کے سبب سے بے گانہ بن کے رہ گئے تھے اور ان لوگوں کو اپنا بھائی اور عزیز بنایا جو دین میں ان کے شریک بن چکے تھے۔ مدد کرنے والوں نے اپنے ان عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا جن سے وہ خون اور نسب اور ہم وطنی کے رشتے رکھتے تھے لیکن دین میں ان سے مختلف ہو گئے تھے اور ان کو چھوڑ کر ساری محبتیں اور ساری جاں نثاریاں ان لوگوں کے لیے وقف کرنے پر آمادہ ہو گئے جن سے اگرچہ وہ خون اور ہم وطنی کا اشتراک نہیں رکھتے تھے لیکن ایمان و اسلام کے رشتے نے اب ان کو ایک کر دیا تھا۔ اس ہجرت اور نصرت نے ایک نئے معاشرہ کی بنیاد رکھ دی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ کا نہایت گہرا تعلق قائم ہو گیا۔ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے ایثار اور قربانی کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی نظیر خونی اور نسبی رشتوں میں ملنی مشکل تھی۔ لوگوں نے اپنی جایدادوں اور اپنے کاروبار میں اپنے مہاجر بھائیوں کو برابر کا شریک بنا دیا۔ بعضوں نے، جن کے نکاح میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں، اپنی ایک بیوی کو طلاق دے دی کہ ان کا مہاجر بھائی اس سے نکاح کر لے۔ اس دینی مواخات کو ایک خاص زمانہ تک صرف اخلاقی ہی حیثیت حاصل نہیں رہی بلکہ اس کی ایک شرعی اور قانونی حیثیت بھی تھی۔ تقسیم وراثت تک میں

اس کا لحاظ ہوتا تھا۔

جو مسلمان کسی غلط ماحول میں اگرچہ وہ اس کا وطن ہی ہو، گھرا ہوا تھا اس کے لیے از روئے شرع یہ ضروری ہوا کہ وہ اس غلط ماحول سے نکل کر اس صالح معاشرہ میں شامل ہو جائے، اور اگر وہ بغیر کسی شدید مجبوری کے اس سے گریز اختیار کرتا تو وہ منافق شمار ہوتا اور مسلمانوں پر سے اس کی نصرت و حمایت کی شرعی اور قانونی ذمہ داری ساقط ہو جاتی۔ اس سلسلے کے بعض احکام ملاحظہ ہوں :۔

"تم اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا عزیز و قریب نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور جو ان کو عزیز و قریب بنائیں گے تو وہی لوگ ظالموں میں سے ہوں گے۔ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے، وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکان جو تمہیں پسند ہیں اگر یہ تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ اور اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔" (۲۳-۲۴ توبہ)

"جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور مال اور جان سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ ایک دوسرے کے عزیز و رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان تو لائے پر انہوں نے ہجرت نہیں کی تمہارے اوپر ان کی نصرت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔" (۷۲۔ انفال)

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص قوم کے لوگ اور آپ سے اخوت و رشتہ داری اور ہم وطنی کے تمام روابط رکھتے تھے اس نئے معاشرہ میں ان کے لیے بھی اس وقت تک کوئی جگہ نہیں تسلیم کی گئی جب تک وہ توبہ اور اصلاح کر کے اس معاشرہ کے بنیادی اصولوں کی پابندی کا اعلان نہ کریں۔ فرمایا :۔

"پس اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔" (۱۱۔ توبہ)

اس معاشرہ کے اندر ایمانی و اسلامی اقدار کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ اس میں ہر گھس آنے والے کو، وہ کسی محرک کے تحت گھس آیا ہو، جگہ نہیں دی گئی بلکہ صرف انہی لوگوں کو جگہ دی گئی جن کو صرف ایمان و اسلام کی کشش نے دوسروں سے کٹنے اور اس کے اندر داخل ہونے پر آمادہ کیا ہو۔ قرآن کا یہ حکم

ملاحظہ ہو:۔

" اے ایمان والو، اگر تمہارے پاس مومنہ عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو ان کو جانچو۔ اللہ ان کے ایمان سے اچھی طرح باخبر ہے۔۔۔ پس اگر تم ان کو مومنہ پاؤ تو ان کو کفار کی طرف نہ لوٹاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور تم کافرہ عورتوں کی عصمتوں کو اپنے قبضہ میں نہ رکھو۔" (۱۰۔ ممتحنہ)

اس معاشرہ کے اندر ایک زرخرید لونڈی اگر وہ مسلمہ ہے اس شریف زادی پر ہزار درجہ ترجیح رکھتی تھی جو مشرکہ ہو۔

" اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومنہ لونڈی ایک مشرکہ شریف زادی سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی بھلی لگے اور مشرکوں کے نکاح میں اپنی لڑکیاں نہ دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں، ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنا ہی بھلا لگے۔" (۲۲۱ بقرہ)

اس معاشرہ میں اخوت اور بھائی چارگی کی بنیاد خاندان یا وطن کے بجائے ایمان و اسلام کے رشتہ پر رکھی گئی۔

" اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں" (۱۰ الحجرات)

مسلمانوں کی تعریف یہ بیان کی گئی کہ وہ آپس میں رحم دل اور کریم النفس ہیں۔ برعکس اس کے اہلِ کفر کے لیے وہ سخت ہیں۔ ان کو یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ ان کے اندر دراندازی کرسکیں یا ان کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرسکیں۔

" محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔" (۲۹ فتح)

(باقی)

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

نعیم صدیقی

(گذشتہ سے پیوستہ)

اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کے ذریعے متبنّیٰ کے بارے میں غلط تصورِ رائج کو بھی توڑنے کا ارادہ فرمایا۔ بس جب ہوا یہ کہ زوجین میں ناسازگاری ہو چکی اور اس میں وہ ذہنی تفاوت موثر ہوا جو بطورِ محرک واقعہ کے فریقین میں موجود تھا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایات آنے لگیں لیکن معاملات سلجھنے کے بجائے بگڑتے چلے گئے یہاں تک کہ بالآخر زیدؓ طلاق دینے کا ارادہ آپؐ کے سامنے ظاہر کرنے لگے۔ اس پر آپؐ کو بڑی تشویش ہوئی کہ ایک ایسا نکاح ٹوٹ رہا ہے جو معاشرے میں ایک نئی انقلابی مثال قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ نیز اس میں خود رسول اللہ کی تحریک اور مشورے کو بڑا دخل تھا اور آپؐ کہ چونکہ زید کی طرف سے ولی تھے اس لیے آپؐ کی بڑی ذمہ داری تھی۔ آپؐ نے بار بار اس رابطے کو بچانے اور حضرت زیدؓ کو طلاق سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن آخرکار یہ ساری کوشش ناکامی کی سرحد کو آپہنچی ہوگی اور جس طرح کی شکایات پیدا ہوں گی ان کے ازالے کی ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ آپؐ خود زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ شریعت میں پوزیشن بالکل صاف تھی اور اس معاملے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن سابق جاہلی اثرات کے تحت اندیشہ تھا کہ لوگوں کو اچنبھا ہوگا اور ساتھ ہی مخالفین پروپیگنڈے کا ایک موضوع پالیں گے لیکن مرضی الٰہی یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت سے متبنّیٰ کی جو غلط پوزیشن چلی آرہی تھی اس کی نفی خود آپؐ ہی کے ذریعے پوری ہدایت و صراحت سے کر دی جائے تاکہ اس رسمیت کی جڑ بالکل کٹ جائے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے مخفی خیال اور تفکر کو اٹھا کر برسرِ عام

رکھ دیا۔ فرمایا وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ (احزاب - ۳۷) انداز تنبیہ کا ہے تم اپنے دل کے پردۂ خفا میں وہ بات لیے ہوتے ہو جسے اللہ کھول دینے والا ہے ...... اور تم لوگوں سے اندیشہ کرتے ہو، یعنی ایک بات جو خدا کی شریعت میں روا ہے اسے لوگوں کے جاہلی تصورات کے اندیشے سے دل میں چھپائے رکھنا اللہ کو ناپسند ہے۔ اسے سامنے آنا چاہیئے اور اس کو واقع ہونا چاہیے، تاکہ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا (ایضاً - ۳۷) مقصود اس سے یہ تھا کہ منہ بولے بیٹوں کے بارے میں وہ غلط قید جو لگی چلی آرہی ہے وہ مسلمانوں کے اوپر سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔ اسی زنجیر جاہلیت کو کاٹنے کے لیے بھرپور ضرب لگانے کی یہ شکل اختیار کی گئی کہ حضورؐ سے حضرت زینب کا رشتۂ نکاح خود اللہ تعالیٰ نے بطور خاص قائم فرما دیا۔

بس اس واقعہ کا ہونا تھا کہ مدینہ کے دشمنانِ حق کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ لوگ پروپیگنڈا کرنے لگے کہ دیکھا، یہ مذہبیت و تقدس کا ڈھونگ! منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی رچالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زیب داستاں کے لیے افسانے بھی گھڑ لیے گئے۔ منہ پھٹ یہود اور منافقین نے یہ چرچا کیا کہ (نعوذ باللہ) اصل میں تو یہ ہو پر عاشق ہو گئے تھے۔ اسی لیے طلاق دلوائی اور پھر نکاح گانٹھ لیا۔[1] نکاح بھی ایسا ویسا نہیں، آسمانی

---

[1] واضح رہے کہ زمانۂ حال کے متعصب مستشرقین نے تاریخ کے اوراق سے وہ سارا گندا مواد جس جس کے علم و تحقیق کے دامن میں بھر لیا ہے جو تحریک اسلامی کے معاندین نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ خود یہ واقعہ بھی ان اصحابِ دانش و تحقیق کے ہاں ایک مقبول ترین موضوعِ بحث بنا اور اس کو خوب نمک مرچ لگا لگا کر کتابوں کے اوراق پر پھیلا دیا گیا۔ ایک گھٹیا اور بازاری قسم کا افسانہ مکمل کر کے سامنے لایا جاتا ہے جس کا لفظ آغاز یہ ہے کہ حضور کی نگاہ اتفاقاً زینب پر پڑ گئی اور جذبات بے قابو ہو گئے! ذرا سوچو کہ وہ شخص جو بے داغ جوانی کو لیے ہوئے ہمہ وقت مصروف رکھنے والی جدوجہد میں ساری عمر منہمک رہا اور جسے چین کا سانس لینا کبھی نصیب نہ ہوا۔ اس کا کردار عین پختگی کے نقطے پر پہنچ کر بس یہی کچھ رہ گیا تھا کہ اس کا دل اس کی آنکھوں کی پلکوں پر دھرا ہوا ہو۔ کیا یہ الزام اس کے مجموعی کردار میں کھپ سکتا ہے۔ پھر حضرت زینب حضور کی پھوپھی کی لڑکی تھیں اور بچپن سے آپ کے سامنے کھیلیں اور جوان ہوئیں، ان کا وجود کوئی نیا انکشاف نہیں تھا۔ پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آپؐ نے خود بڑے اصرار سے حضرت زید کے ساتھ ان کا نکاح کرایا تھا اور اس نکاح میں آپ زید کی طرف سے ولی تھے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

منعقد ہوگیا۔ اس نکاح کے لیے زمین ہموار کرنے کو اپنے مطلب کی وحی بھی نازل کرا لی۔ اس سے پہلے اب تک اعتقادی اور کلامی اور فقہی امور میں مخالفانہ سرزہ سرائیاں تھیں، مگر اس واقعہ کے سلسلے میں توصحیح معنوں میں گندا پروپیگنڈا کیا گیا ہے اور محسنِ انسانیت کے اخلاقی مرتبے پر ہلہ بولا گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کسی تحریکِ تعمیر و اصلاح کے لیے سب سے زیادہ کاری وار اخلاقی پہلو ہی سے ہوسکتا ہے۔ کسی صاحبِ دعوت کے بارے میں اگر مخالفین یہ غوغا آرائی کرنے لگیں کہ وہ بندۂ ہوس ہے۔ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے لیے ہر طریقے سے کاربرآری کرسکتا ہے اور وہ کسی اخلاقی معیار کا احترام کرنے پر تیار نہیں تو اس سے بڑھ کر تعمیری کام کو نقصان پہنچانے والا حملہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ بڑی آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مدینہ میں دشمنانِ حق نے کتنی گندگی اس واقعہ پر پھیلائی ہوگی، کتنی سڑاند پیدا کردی ہوگی، اور انسانیت کے سب سے بڑے خیرخواہ پر کئی روز تک کیسی سخت کرب کی گھڑیاں گذری ہوں گی۔

یہود کا یہ پروپیگنڈا بے چارے مسلمانوں کے لیے بھی بیحد پریشانیوں کا موجب ہوا ہوگا۔ ان کو راہ چلتے چھیڑا جاتا ہوگا۔ ان پر فقرے کسے جاتے ہوں گے اور ان کو شبہات کے چکر میں ڈالا جاتا ہوگا۔ ان میں نومسلم بھی تھے جو اپنے کچے پن کی وجہ سے گھبرا اُٹھتے ہوں گے۔ ان میں منافق بھی گھسے پڑے تھے۔ اور وہ اپنے جن کر عجیب طرح کی دورنگی باتیں ترشتے ہوں گے۔ اس حالت میں مسلمانوں کی تسکین اور تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے چند حقائق ان کے ذہن نشین کرائے۔ ان کو بتایا کہ "نبی پر کسی ایسی بات میں کوئی مضائقہ نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طے کردیا ہو" (احزاب — ۳۸) اس اقدام کا مقصد بھی واضح کردیا کہ "مسلمانوں کے لیے منہ بولے بیٹوں سے نکاح کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے" (احزاب ۳۷) یہ اعلان بھی کردیا کہ "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں" (احزاب ۴۰) آخر میں خود حضورؐ سے خطاب فرما کر کہا کہ "کافروں اور منافقوں کی نہ مانو اور ان کی دلآزاریوں کو بالائے طاق رکھ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو اور اللہ

(بقیہ حاشیہ) حالات کی یہ ساری ترتیب کیا اس افسانہ کے لیے واقعی کوئی بنیاد فراہم کرتی ہے جسے مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپیگنڈا کے محاذ کا ایک بم بنانے میں بطور مسالہ استعمال کیا تھا اور اب اسی مسالے کو دوبارہ مستشرقین اسلام کے خلاف استعمال کررہے ہیں؟ کیا یہ باتیں عقلیت (RATIONALISM) اور تحقیق (RESEARCH) کے دعوے داروں کے اپنے معیارات پر پوری اترتی ہیں؟

کارسازی کے لیے کافی ہے" (احزاب ۴۸) اس سنجیدہ اسلوب سے اس مکروہ اور گندے پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا جو یہود کی طرف سے حد درجہ کی ذہنی پستی کے ساتھ اٹھایا گیا تھا۔

ایک اور گندے بہتان کا طوفانِ عظیم اوپر کے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحریک اسلامی کے نظریہ و نصب العین پر جب کسی طرف سے بھرپور وار کرنے کا موقع نہیں ملتا تو اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا طریقہ شیطان کی نگاہ میں یہی رہ جاتا ہے کہ اس کے علم بردار کی شخصیت اور اس کی قیادتِ عظمیٰ کے دامنِ تقدس پر گندگی کے چھینٹے ڈال دیے جائیں۔ سو ایک موقع پر اقتدار طلبی کا اور دوسرے موقع پر نفسانیت کا گھناؤنا الزام اس کے خلاف اچھال دیا گیا۔ اب یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے اور اسلامی تحریک کے قائدِ اعلیٰ کے حرم کو نشانہ بنایا جاتا ہے جو ساری امت اور ساری انسانیت کے لیے معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے مرکزی نمونہ ٹھیرایا گیا تھا۔ اسی حرم کے گرد نئی اسلامی معاشرت کا چھتہ تیار ہو رہا تھا، اور اس چھتے کو برباد کرنے کے لیے کارگر وار وہی ہو سکتا تھا جو اس کے مرکز پر کیا جائے۔ منفی تخریبی طاقت نے یہ آخری وار بھی کر ڈالا۔ اس مخالفانہ وار کی دردناک داستان واقعۂ افک کے عنوان سے قرآن، سیرت اور تاریخ کے دفتروں میں عبرت اندوزی کے لیے محفوظ ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اصل واقعہ کی حقیقت سامنے لائیں، یہ بات واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اتنے گندے بہتان کا طوفانِ عظیم آخر اسلامی تحریک کے پیدا کردہ صالح معاشرے اور تربیت یافتہ نظامِ جماعت میں اٹھ کیسے سکا؟ کن رخنوں سے یہ طوفان تنظیم کے قلعے میں داخل ہوا اور کیسے اسے کچھ دیر کے لیے ہولناک انارکی و خلفشار پیدا کرنے کا موقع ملا۔

فتنہ آرائی کے لیے سازگار فضا شیطان کو اسلامی نظامِ اجتماعیت میں تخریب و انتشار کے ہنگامے کھڑے کرنے کے لیے بہرحال ایک خاص فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فضا چاہے جماعت کے نظم و اخلاق کی کسی کمزوری کی وجہ سے موجود ہو جائے یا حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر پائی جائے۔ بہرحال فتنہ انگیزی کی کچھ [illegible] جب پوری ہو جائیں تو شیطان کا کید کچھ گل کھلا سکتا ہے۔ نظام [illegible] ہے اس میں شیطان کے لیے کام کرنے کے مواقع کسی نہ کسی حد تک ضرور باقی رہتے [illegible]

مثالی سوسائٹی کیوں نہ موجود ہو۔ درحقیقت انسانی فطرت میں ایسی کمزوریاں موجود ہیں کہ جن کے راستے فتنہ کا سیلاب در آتا ہے۔ نبی کی پیدا کردہ جماعت کے بارے میں بھی یہ گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ اس کے دائرے میں فتنے کی طاقت کو کام کرنے کا سرے سے موقع ہی نہیں ملے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تندرست سے تندرست آدمی بھی کبھی نزلے، زکام یا بخار میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک پاکیزہ سے پاکیزہ معاشرہ کو بھی حالتِ مرض پیش آسکتی ہے۔ ایک زندگی سے بھرپور اچھے معاشرے سے توقع یہی کی جاسکتی ہے کہ وہ مرض کی مدافعت میں کوتاہی نہ دکھائے گا، اور حملہ آور جراثیم کو ہلاک کر کے باہر پھینک دے گا۔ مگر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس میں کوئی مرض کبھی پیدا ہی نہ ہوگا۔

شیطان کے لیے ایک نظامِ جماعت میں سازگار ترین فضا نجویٰ کی فضا ہوتی ہے۔ نجویٰ سرگوشی کو کہتے ہیں کسی اجتماعی نظام میں نجویٰ کے اصطلاحی معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ پوری جماعت کے سامنے کھلم کھلا اپنے خیالات، مشوروں، تنقیدوں اور اعتراضوں کو پیش کرنے کے بجائے متفرق افراد علیحدگی میں بیٹھ کر کھچڑی پکائیں۔ نجویٰ درحقیقت اجتماعی زندگی میں ایک برے راستے کی طرف پیش قدمی کا آغاز ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے جبھی کھلے میدان کام کرنے سے آدمی کتراتا ہے اور سامنے آنے سے پہلے چپ چپاتے کھچڑی پکانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی چیز آخر کار سازش کی شکل اختیار کرتی ہے۔

بدقسمتی سے حضورِ اکرم کی نگرانی میں چلتی ہوئی تحریک کے اندر یہود کی سرپرستی میں منافقین نے نجویٰ کی یہ فضا پیدا کر دی تھی اور یہ برابر تحریک کے قائد اور کارکنوں کو پریشان کرتی رہی۔ قرآن اس فضا کے بنانے والوں کو بھی درس اصلاح دیتا رہا اور اسلامی نظامِ جماعت کے کارفرماؤں کو بھی اس کے بارے میں برابر انتباہ دیتا رہا۔ وہ پکارا:

"کیا تم دیکھا نہیں جنہیں سرگوشیاں کرنے سے باز آنے کو کہا گیا تھا وہ پھر وہی حرکت کرتے ہیں جس سے انہیں روکا گیا تھا اور وہ آپس میں گناہ اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی پر خفیہ مشورے کرتے پھرتے ہیں۔" (المجادلہ - ۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں پوشیدہ مشورے کرو تو گناہ اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی کے تحت

نہ باندھو بلکہ نیکی اور تقویٰ کے لیے مشورے کرو۔" (مجادلہ ۹)

" یہ خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں تاکہ وہ ایمان لانے والوں کو پریشان کرے، حالانکہ بغیر اللہ کے اذن کے کوئی بھی چیز ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی" (مجادلہ ۱۰)

" یہ (سرگوشیاں کرنے والے) لوگ انسانوں کی نگاہ سے تو اوجھل رہ سکتے ہیں، مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ حال یہ کہ جب وہ رات کی تاریکی اور تنہائی کے پردے میں وہ ایسی کوئی بات پکاتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں ہوتی تو اس گھڑی اللہ ان کے ساتھ موجود ہوتا ہے" (النساء ۱۰۸)

" خفیہ مشورے کے لیے کوئی تین آدمی ایسے جمع نہیں ہوتے کہ ان کے ساتھ چوتھا اللہ نہ موجود ہو اور نہ پانچ کہ جن کے ساتھ چھٹا وہ نہ ہو۔ اور نہ اس سے کم یا اس سے زیادہ تعداد کہ ان کے ساتھ وہ موجود نہ ہو — خواہ وہ کہیں بھی ہوں" (مجادلہ ۷)

" وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم (جماعت کے فیصلوں اور قیادت کے احکام کی) اطاعت کریں گے! مگر جب (اے نبی) آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک ٹولی راتوں کو سر جوڑ کر تمہاری کہی ہوئی باتوں کے خلاف کھچڑی پکاتی ہے اور اللہ ان کے منصوبوں کو لکھ رہا ہوتا ہے" (النساء ۸۱)

ان آیات میں یا تنبیہ بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ اسلامی نظام جماعت اجتماعی طور پر جن طے شدہ خطوط پر چل رہا ہو اور جو اجتماعی فیصلے اور جماعتی روایات اس کے اندر کارفرما ہوں ان کی حمایت و وکالت اور ان کی پابندی و پیروی اور ان کے نفاذ و استحکام کے لیے تو علیحدگی میں افراد باہم دگر علانیہ بھی اور تنہائی میں بھی آزادانہ بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیکن ان سے اختلاف کرنے اور ان کو شکست دینے، ان کے خلاف بددلی پھیلانے اور اعتراضات اٹھانے اور ان کا رُخ پھیر دینے کے لیے علیحدگی میں بیٹھ کر افراد کا خفیہ مشورے اور سرگوشیاں کرنا ایک ایسا گھناؤنا گناہ ہے جو ان افراد کی سیرت و عاقبت کو تباہ کر دیتا ہے اور پورے نظام جماعت کو پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ خفیہ اختلافی سرگرمیوں کا اصل سررشتہ [illegible] قرآن نے خبردار کر دیا۔

خفیہ سرگوشیوں کا ایک موضوع "معصیت الرسول" بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ درحقیقت یہی مرکزی

موضوع تھا۔ مدینہ کی تحریکِ اسلامی کے دائرے کے اندر اس امر کی تو سرے سے گنجائش نہ تھی کہ نفس تحریک اور اس کے نظریہ و نصب العین کو پروپیگنڈے کا ہدف بنایا جا سکے اور خود خدا کی نافرمانی اور اس کی کتاب سے بغاوت کا اقدام کیا جا سکے۔ منافقین کے لیے زیادہ سے زیادہ میدانِ فتنہ اتنا ہی تھا کہ تحریکِ اسلامی کی قیادت سے الجھیں اور علمبردارِ اول کی شخصیت کے خلاف لاوا اگلتے رہیں۔ ایک اخلاقی تحریک کے لیے تباہی کا سب سے زیادہ کارگر اور سہل ترین حربہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی بہترین شخصیت کو داغدار کر دیا جائے

اس سلسلے میں یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ اقتدار طلبی اور نفسانیت کے الزامات پہلے ہی عائد کیے جا چکے تھے لیکن درحقیقت معاملہ ایک الزام یا دوسرے الزام تک محدود نہیں تھا۔ شوشہ بازی کی ایک مہم — (WHISPERING COMPAIGN) اور "سرد مہم" برابر علانیہ جاری رہی۔

مثلاً بعد کے دور میں جب کہ زکوٰۃ کا نظامِ وصول و صرف باضابطہ طور پر قائم ہو گیا۔ حضور پر ایک کھلا الزام یہ بھی عاید کیا گیا تھا کہ آپ بیت المال میں آنے والے صدقات کو من مانے طریق سے اڑا دیتے ہیں[1]۔ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ تمام اندوختوں اور کاروباری سرمایوں اور مواشی اور زرعی پیداواروں میں سے جب باضابطہ خدا کے حاجت مند بندوں کا حق لیا جانے لگا تو ڈھیروں دولت ایک مرکز پر سمٹنے اور سرکارِ دو عالم کے مبارک ہاتھوں سے بارانِ رحمت کی طرح تقسیم ہونے لگی۔ دولت کی اس بہتی گنگا کو دیکھ کر زر پرستوں کے منہ میں پانی بھر آتا اور وہ چاہتے کہ جاہلی دور کی طرح آج بھی اس گنگا سے وہی ہاتھ رنگیں جو پہلے سے مضبوط مالی حیثیت کے مالک ہیں، لیکن اسلامی تحریک کے قائم کردہ نظامِ معیشت نے دولت کے بہاؤ کا رُخ، غریب طبقوں کی طرف پھیر دیا تھا اور اربابِ جاہ و حشم اس انقلاب پر کڑھتے تھے۔ وہ فی نفسہٖ اسلامی نظامِ معیشت پر تو حملہ کر نہ سکتے تھے۔ جو ان کی جیبیں بھاری کرنے کے بجائے الٹا ان سے بزورِ قانون "زکوٰۃ" کا "جرمانہ" وصول کر رہا تھا۔ بس دل کا بخار نکالنے کے لیے محسنِ انسانیت ﷺ کو نشانہ بنا لیتے ان کا کہنا یہ تھا کہ دولت اپنے حامیوں اور اپنے چہیتوں میں تقسیم کی جا رہی ہے اور مہاجرین کو خاص طور پر نوازا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدائی خزانے کے بل پر دوست نوازی اور کنبہ پروری ہو رہی ہے۔

---

[1] وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ۔ القرآن : سورۃ توبہ

منفرق گفتگوؤں میں مسالہ لگا لگا کر کہا جاتا ہوگا عام لوگوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی خدا کے نام پہ نچوڑی جاتی ہے لیکن اسے اپنی دھاک بٹھانے اور اپنا اقتدار مسلط کرنے کے لیے بے دردی سے استعمال کیا جا رہا ہے، پبلک فنڈز کے بارے میں کسی بھی نظام میں قیادت پر الزام لگ جائے تو سنگین ہوتا ہے، لیکن خاص طور پر ایک دینی و اخلاقی نظامِ معاشرہ میں جہاں خزانہ اللہ کا مال کہلاتا ہو اور جس کا ہر آمد و صرف اللہ کے نام سے اور اس کے احکام کے تحت کیا جاتا ہو وہاں ایسے الزام سے شدید جذباتی ہیجان پیدا کیا جا سکتا ہے۔

غور فرمائیے یہ الزام نمونے کی اس شخصیت پر چپکایا جا رہا تھا جس نے صدقہ کی آمدنی کو خود اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے نہیں، پورے خاندانِ بنی ہاشم کے لیے بمنزلہ حرام کے قرار دے لیا تھا۔ یہ شان بے لوثی جس کی کوئی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی، اس کے براق دامن پر بھی نہایت ادنیٰ سیرت کے لوگوں نے اٹھ کر چھینٹے ڈال دیے۔

پھر یہی لوگ تھے جن کی تعریف قرآن یوں کرتا ہے کہ یہ اپنی باتوں سے نبی کی ذات کو دکھ دیتے ہیں، یعنی تحریک کے اجتماعی مسائل پر صاف دل سے کھلی فضا میں بات کرنے کے بجائے، یہ اس کے عناں بردار کی شخصیت کو نشتر لگاتے رہتے تھے۔ اس نشتر زنی کی ایک مثال قرآن نے خود ہی بیان کر دی ہے۔ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ اسلامی نظامِ جماعت میں منافقین کی حرکات و سکنات ایک ایسی بے جوڑ چیز تھیں کہ ان کی بو اہلِ ایمان کی فطرتِ صالحہ کو ناگوار گزرتی تھی اور وہ مضطرب ہو ہو جاتے تھے۔ اس پر مشکل یہ تھی کہ منافقین کی پراسرار حرکات پر قانون اور نظم کے تقاضوں کے تحت باقاعدہ گرفت کرنا بھی مشکل اور ان پر دم سادھے رہنا بھی مشکل! اہلِ ایمان بیچارے جماعتی ذمہ داری کے تقاضے سے مجبور ہو کر اہلِ نفاق کی غیر صحت مندانہ حرکات سے حضور پاکؐ کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ہر نفاق زدہ آدمی آہستہ آہستہ جماعت میں پہچان لیا جاتا، اور اس کے بارے میں عناں بردارِ تحریک کی شخصیت ایک خاص طرح کا ردِ عمل دکھاتی جو انتہائی نرمی کے اسلوب سے آہستہ آہستہ سختی کے انداز میں بدلتا گیا۔ ان حالات میں مریضانِ نفاق اپنے آپ کو ذلیل پاکر چرچا کرنے لگے کہ "ھُوَ اُذُنٌ" (توبہ ۶۱) یعنی نعوذ باللہ، یہ شخص تو کان کا کچا ہے، معمولی سے معمولی مرتبے کے آدمی، جن کی ہمارے مقابل میں کوئی ہستی ہی نہیں، جا کر جو باتیں چاہیں کہہ آتے ہیں۔

اور وہاں ہر چیز پر یقین بھی فوراً کرلیا جاتا ہے۔ میر کارواںؐ کی اس کمزوری کی وجہ سے ہم مارے جاتے ہیں۔ اب ہم تو ٹھہرے منافق اور سازشی، اور کل کے لیے حیثیت ونڈے اور رفاقتوں مارے غلام ہو گئے مقربین خاص!

کچھ ایسے ہی حالات کا ردِ عمل ہوگا کہ ایک دفعہ منافقین نے تحریک کے علمبردارِ اول سے علیحدگی میں وقت لینے اور گفتگوئیں کرنے کا ایک چکر چلا دیا۔ مجلس آراستہ ہے، ایک منافق صاحب بیچ میں بول اٹھتے ہیں کہ مجھے ذرا علیحدگی میں خاص بات کرنی ہے۔ حضورؐ بربنائے مروت اس کا موقع ہر کسی کے لیے کھلا رکھتے تھے، لیکن علیحدگی میں خاص باتیں کرنے اور وقت لینے کا یہ ڈرامائی سلسلہ کسی اور غرض سے تھا، اس سے منافقین کا مدعا یہ تھا کہ ایک تو جماعت پر اپنی دھاک جمائیں کہ ہم خاص الخاص لوگ ہیں صرف اوپر کے دائرے میں ذمہ دار ترین ہستی سے خاص باتیں کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ حضورؐ کی نگاہ میں مصنوعی طریق سے تقرب و اعتبار حاصل کیا جائے اور جہاں تک ہوسکے اہل اخلاص کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کرکے اُس ذلت کا اپاڈ ٹلکالا جائے جس میں اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے یہ حضرات گھر گئے تھے لیکن حضورؐ کی مروت نے منافقین کو جس تضیعِ اوقات کا کھلا موقع دے دیا تھا اسے فرمانروائے حقیقی نے یہ حکم دے کر ختم کردیا کہ:

اے ایمان والو! جب تم پیغمبر سے (خاص وقت لے کر) علیحدگی میں بات کرو تو ہر گفتگو کے خاص سے قبل صدقہ پیش کرو۔ (مجادلہ - ۱۳)

اس حکم سے بُخل کے مارے ہوئے منافقین کی کمر ٹوٹ گئی اور یہ خاص وقت لینے اور علیحدگی میں بات کرنے کا سلسلہ رُک گیا، تاہم یہ شروع اسی تصور سے کیا گیا تھا کہ عنان بردارِ تحریک کان کا کچا (خاک بر سر الشیاں) ہے سوال اہلِ دعوت کے مقابلے میں کیوں نہ ہم بھی کان بھر کر اپنے اپنی رو میں بہالے جائیں۔ مگر ان کو اندازہ نہیں تھا کہ وہاں اہلِ اخلاص کے لیے کان جتنے نرم تھے، اہل فتنہ کے لیے اتنے ہی ثقیل بھی تھے۔ بہرحال اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو لوگ تحریکِ اسلامی کے اندر رہ کر اس کے عنان بردارِ اعلیٰ کے خلاف ایسی تحقیر آمیز باتیں کرتے پھرتے ہوں گے ـــــ ان میں نظم سے وہ محبت و وابستگی باقی کیسے رہ سکتی تھی جو کسی جماعت کے کارکنوں کو فعال اور متحرک بناتی ہے۔ ایک دینی و اخلاقی نظامِ جماعت میں تو جو عنصر اس کے نظام امر و قیادت کے خلاف

تحقیر کا طوفان اٹھاتا ہے اور سرگوشیوں کی مہم چلاتا ہے وہ درحقیقت سرے سے اس کی حرکت، اس کے اقدام اور اس کی فعالیت کی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

تحریک جب دعوت کے مرحلے سے جہاد کے مرحلے کی طرف ایک انقلابی موڑ مڑی تھی اسی وقت ایک بڑی تعداد کا نفاق ابھر آیا تھا۔ تحریکوں کے ایسے موڑ بہت سے لوگوں کو چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر توازن صرف وہی کارکن برقرار رکھ سکتے ہیں جو پہلے سے سمجھ کر چلے ہوں کہ ہم جا کدھر رہے ہیں اور کیا کیا منازل راہ میں پڑیں گی۔ ورنہ دنیا بھر کی تحریکوں کو جب کوئی ایسا بڑا موڑ پیش آتا ہے اور وہ جست لگا کر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہیں تو اس تفسیر کا صحیح فہم نہ رکھنے والا ضرور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ عنصر ایسے ہی تاریخی مواقع پر بسا اوقات اچھے خاصے متحرک افراد ذہنی الجھنوں میں پڑ کر بددلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی تحریک اسلامی کے ساتھ بھی ہوا۔ تحریک دعوت سے جہاد کے مرحلے میں داخل ہوئی تو کچھ لوگ اپنا فکری توازن کھو بیٹھے اور خاص طور پر وہ عنصر تو ہمیشہ کے لیے نفاق کا شکار ہو گیا جو جہاد کی گراں بار ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے آمادگی نہیں رکھتا تھا اور پہلے سے ذہن و فکر کو اس مرحلے کے لیے تیار کر کے نہیں لایا تھا۔

قرآن میں مذکور ہے کہ کچھ لوگ تھے جن کو جب پہلے دور میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ "کفوا ایدیکم" یعنی دعوت حق پہنچاتے ہوئے ظلم و زیادتی کو خموشی سے برداشت کرو اور ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بس اقامت نماز اور ایتائے زکوٰۃ جیسی سرگرمیوں میں منہمک رہو۔ (النساء ۷۷) لیکن ان کو اس دور میں یہ حکم ناگوار تھا بعد کے مرحلے میں جب انہی لوگوں کو "جہاد" کا حکم سنایا گیا تو وہ انسانی قوتوں سے خوفزدہ ہو کر ٹھٹک سے گئے۔ ان کا ذہنی ردِ عمل یہ تھا کہ رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ؟ (اے ہمارے رب! تو نے جہاد کا حکم ہمارے سر کیوں ڈال دیا؟ ابھی ہم اور دعوت دیتے، نماز و زکوٰۃ کے ذریعے فلاح سیرت کرتے، چندے اور تعمیری سرگرمیاں جاری رکھتے، ایک مرحلہ کے تقاضے پورے نہیں ہوئے کہ وقت سے پہلے نئی ذمہ داریاں لاد دی گئیں ہیں۔

مگر بیچارے خدا سے تو بحث کر سکتے تھے نہ اس کے احکام کے آگے کوئی بند کھڑا کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے تو مردِ رسول کی ذات تھی، چنانچہ اس ذات اور اس شخصیت کو انھوں نے آخر دم تک نہ بخشا۔ یہ ہر معرکہ جہاد سے کنی کاٹتے رہے اور ہر نازک موقع پر طرح طرح کی باتیں گھڑتے رہے۔ انھوں نے خدا کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا

انتقام ان کے دین کی تحریک چلانے والے علمبردارِ حق سے دل کھول کر لیا۔

تحریکیں جب معرکہ آرا ہوتی ہیں تو ان کے علمبردار مخالف طاقت کو جہاں ضربیں لگاتے ہیں وہاں ان کے ہاتھوں چوٹوں پہ چوٹیں کھاتے بھی ہیں۔ تدابیر کے تیر نشانے پہ لگتے بھی ہیں اور اچٹ بھی جاتے ہیں۔ نتائج امیدوں کے مطابق بھی نکلتے ہیں اور خلاف بھی نکل آتے ہیں۔ ایسا تو کوئی بھی میدان کارزار نہیں پایا گیا جس میں ہر نقصان ایک ہی فریق کے حصے میں آئے اور ہر فائدہ دوسرے فریق کے حصے میں رہے، جو فریق آخری فتح بھی حاصل کرتا ہے وہ بھی بہت سی جانیں فتح کی قیمت میں پیش کرتا ہے۔ بہت سے زخم کھاتا ہے، بہت سامان جنگ کی آگ میں جھونکتا ہے، لیکن مدینہ کی اسلامی تحریک کے اندر کام کرنے والے منافقین اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا کے اس فلسفۂ ربانی سے خالی الذہن ہو کر ہر تکلیف اور ہر نقصان اور ہر چوٹ پر بے اختیار چلا اٹھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے تحریک کے کارپرداز کی کوتاہی بصیرت کا (نعوذ باللہ) قرآن میں اس ٹھنڈے ٹھنڈے فلسفیانہ پروپیگنڈے کا واضح طور پر تذکرہ موجود ہے:

"اور اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری (مراد ہے، ذاتِ رسالت مآب) بدولت ہے۔" (النساء)

یعنی تحریک کے معرکوں میں جو جو چوٹیں لگتیں، جو نقصانات پیش آتے، جو قربانیاں دینی پڑتیں، اور — جن تدابیر کے نتائج حسب مرادنہ برآمد ہوتے ان سب کی ذمہ داری سردرعالم کی گردن پہ ڈال دی جاتی، کہ یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے۔ مطلب یہ کہ دین فی نفسہ برحق ہے۔ تحریک پاکیزہ، نظامِ حیات لاجواب مگر بس جن ہاتھوں میں رہنمائی ہے انھوں نے سارے کام کو عجیب چکروں میں ڈال دیا ہے۔

ذرا منقیانہ شان ملاحظہ ہو کہ اللہ سے بات بنا رکھی ہے اور فوائد اور کامیابیوں کی نسبت بڑے اہتمام سے اس کی طرف پھیری جارہی ہے۔ گویا پروپیگنڈا فلسفیانہ ہی نہیں بڑا متقیانہ بھی تھا۔ مگر یہ منافقانہ شانِ اتقا جو رسولؐ جیسے سربراہ کارِ تحریک کی خیر خواہی واطاعت کا اتنا بھی حق ادا نہ کر سکی جتنا اسلام نے ایک حبشی غلام تک کی امارت کے لیے طلب کیا ہے اور جو خدا کے رسولؐ اور تحریکِ اسلامی کے بہترین علمبردار سے بالا بالا خدا سے رشتہ قرابت جوڑ رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے بڑھ کر خود فریبی کی اور کونسی شکل ہوگی جو انسان نے اپنی تباہی کے لیے ایجاد کی ہو۔

اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "حسنات" کی جو نسبت وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے تھے وہ بربنائے شکر و اعتراف نہ تھی، بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ حالات کے اندر جو اچھے پہلو ابھر آتے ہیں اور معرکہ آرائیوں سے جو مفید نتائج برآمد ہو جاتے ہیں ان میں محسنِ انسانیتؐ کی قیادت اور بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے پیدا کردہ اتفاقات ہیں[1]۔

مدینہ کی تحریکِ اسلامی کے قائدِ اعلیٰ کو کن ذہنی احوال سے گذرنا پڑتا ہوگا جب کہ ہر موقعِ تکلیف پر گھر کے اندر مخالفانہ تبصرہ کرنے اور ہنسی اڑانے اور تخریب کرنے والے نام نہاد ساتھی موجود ہوں۔ بات بات پر کہتے پھرتے ہوں کہ اس عناں بردارِ تحریک کے ہاتھوں اب یہ مصیبت آپڑی اب وہ زخم لگا، اب ادھر سے تباہی آپڑی ہر اہم اقدام کے نتائج نکل آنے کے بعد پنڈت بن کر بیٹھ جاتے ہوں اور تبصرے کرتے ہوں کہ یوں نہ کیا جاتا اور ووں کیا جاتا۔

اسی سڑے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ ہر معرکہ کے سامنے آنے پر یاوہ گوئی کرنے لگ جاتے۔ مثلاً کہتے: کہ "ہمیں اندیشہ یہ ہے کہ حالات کا کوئی چکر ہمیں اپنی لپیٹ میں نہ لے لے" (المائدہ ۵۲) مراد یہ ہوتی تھی کہ اس تحریک کی گاڑی کو جس ڈھب سے چلایا جا رہا ہے اس کے پیشِ نظر ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ اب کسی چٹان سے ٹکرائی اور اب کسی کھڈ میں گری! ــــ آخر ہم کیوں مفت میں اپنے آپ سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

جنگِ احد کے موقع پر یہی ذہنیت تھی جس نے حسرت ظاہر کی تھی کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا، یعنی "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے" (تفہیم القرآن) سورہ آل عمران آیت ۱۵۴) اس ذہنیت میں آنحضورؐ کی قیادت و بصیرت کے خلاف صریح بے اعتمادی موجود تھی۔ یہ اپنی جگہ عقلِ کل تھے اور جو شخص کئی برس سے وحی الٰہی کی روشنی میں تحریک چلاتا آرہا تھا وہ پیغمبر ہونے کے باوجود ان کی نگاہ میں کچھ نہ تھا۔ اگر کہیں معاملہ کسی پیروِ نبوت کی قیادت کا ہوتا تو خدا جانے بصیرت کے ان ٹھیکے داروں کے

---

[1] اس موقع پر یہ بتا دینا مفید ہوگا کہ صاحب "موضح القرآن" نے اپنے حاشیہ میں بالکل یہی بات یوں ارشاد فرمائی ہے کہ "یہ منافقوں کا ذکر ہے کہ اگر تدبیر جنگ درست آئی اور فتح و غنیمت ملی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہوئی یعنی اتفاقاً بن گئی حضرت کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے تھے، اور اگر بگڑ گئی تو الزام رکھتے حضرت کی تدبیر کا"۔ ملاحظہ ہو حمائل شریف مطبوعہ تاج کمپنی قسم ۳۔

ہاتھوں اس کی کیا گت بنی ہوتی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تحریک کی براہ راست مخالفت کے بجائے سرور عالم کی شخصیت کو ہدف بنا کر بالواسطہ حملے کا کامیاب ترین اسلوب اختیار کیا گیا تھا۔ تحریک کے میر کارواں ہی کے خلاف اعتراضات تحقیر اور بیہودہ حرف گیری کا لاوہ نجویٰ کے ناپاک ماحول میں پکایا جاتا اور اس کی نافرمانی اور اس سے سرکشی کرنے کے لیے نت نئے اقدامات زیر غور لائے جاتے۔

اخلاقی نظام جماعت کی پیچیدگیاں | یہ فضا شیطان کے لیے کام کرنے کا بہترین اور وسیع میدان اپنے اندر رکھتی تھی۔ خاص طور پر اس کے دو پہلو فتنہ پردازوں کے حق میں جاتے تھے۔ تحریک اسلامی کا جماعتی نظام اخلاقی نظام تھا۔ اخلاقی نظام کی ایک خاص پیچیدگی یہ ہے کہ اس میں صریح قابل گرفت واقعات جب تک ثابت شدہ حقائق کی شکل اختیار کر کے سامنے نہ آجائیں ان پر نہ جماعت گرفت کر سکتی ہے اور نہ خرابی محسوس کرنے والے افراد حالات کے دھندلے پس منظر کو آخری نتائج نکلنے سے قبل بر سر عام لا سکتے ہیں۔ اسلام کا اخلاقی نظام جماعت اپنے افراد کو ایک دوسرے کے بارے میں سوئے ظن سے روکتا ہے اور ایک شخص آدمی آخری حد تک مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے مشتبہ طرز عمل کے ہر جز کی بہتر سے بہتر تاویل کرتا رہے اور پھر اگر وہ غیر صحت مندانہ سلسلہ اعمال کی بے شمار کڑیوں کے مل جانے پر اپنے ذہن کی گہرائی میں کوئی بری رائے قائم کر بھی لے تو بھی زیادہ سے زیادہ وقفہ اس انتظار میں گزرے کہ شاید اس کے سوئے ظن کی تردید کرنے والی کوئی واضح حقیقت سامنے آجائے۔

محض تاثرات — چاہے وہ اس کی اپنی نگاہ میں کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں — اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو ایک مقدمہ کے طور پر باقاعدہ جماعت کے سامنے لا کر نظم کو متحرک کیا جائے۔ ان وجوہ سے مدینہ میں اہل اخلاص مجبور تھے کہ وہ فتنہ پسندوں کی ابتدائی سرگرمیوں کو جو نجویٰ کے دھندلکے میں چل رہی تھیں چند خوش آئند آثار و علائم کے سامنے آجانے پر بھی چپ چاپ دیکھتے رہیں۔ ہاں جب فتنہ کی فصل باقاعدہ برگ و بر لانے لگی تو پھر کہیں جا کر اخلاقی نظام جماعت ان کو موقع دیتا کہ وہ زبان کھولیں اور اجتماعی نظم کو حرکت میں لائیں۔

دوسری پیچیدگی اخلاقی نظام جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کے سربراہ کار کی شخصیت اور اس کے دوسرے

اہلِ حل وعقد اور اربابِ امر کی ذوات کو کوئی لپیٹ میں لے لے تو ان کی پوزیشن بڑی نازک ہو جاتی ہے۔ ایک طرف وہی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں جماعت کی انتظامی مشینری کی باگ ڈور ہوتی ہے اور جن کے ہاتھوں فتنوں کا سر کچلا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف فتنے انہی کو نشانہ بنا کر ایسی صورت پیدا کر دیتے ہیں کہ اگر وہ اربابِ فتنہ کا پول ساری جماعت کے سامنے پوری طرح کھلنے سے پہلے ان کے خلاف کوئی کارروائی کریں تو ان پر الزام آتا ہے کہ تنقید اور اختلاف کو دباتے ہیں اور آوازۂ حق بلند کرنے والوں کو آمرانہ طریقوں سے شکست دیتے ہیں جس طرح افراد کے معاملے میں کہا جا سکتا ہے کہ شرافت جہاں سب سے بڑی طاقت ہے، وہاں شرافت ہی سب سے بڑی کمزوری بھی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جماعتوں کے لیے اخلاقی نظام جہاں سب سے بڑی طاقت ہے، وہاں یہی اخلاقی نظام ان کی سب سے بڑی پیچیدگی بھی ہے۔ اس پیچیدگی کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ جماعت اپنے مجموعی ذہن کے لحاظ سے اتنی بیدار اور اپنے کردار کے لحاظ سے اتنی مضبوط ہو کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی چیز کو اپنے اندر چلنے نہ دے۔ اس کے دائرے میں کوئی گوش ہوش جماعتی نظم کے خلاف سرگوشیاں سننے کے لیے تیار نہ ہو اور کوئی زبان کان میں پڑی ہوئی ہر بات کو ادھر اُدھر پھیلانے کی جرأت نہ کرے۔ مگر اس انتہائی معیار تک عملاً جماعت کی جماعت کا پہنچنا اور ہر آن اس پر قائم رہنا مشکل ہے گھٹیا باتیں سوچنے والے دماغوں، ان کو پھیلانے والی زبانوں اور ان کو سننے والے کانوں سے کوئی انسانی معاشرہ بالکل ہی پاک نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر، نطق اور سماعت میں سے شیطان کچھ نہ کچھ حصہ لے ہی اڑتا ہے۔

منافقین نے اخلاقی نظام کی اس ڈھیل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، لیکن انجام کار کے لحاظ سے وہ اس کی زبردست طاقت کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ان کے پورے کارنامے کا خلاصہ قرآن کی زبان میں بس یہ تھا۔ " ھَمُّوا بِمَا لَمْ یَنَالُوا " وہ جس مقصود کی طرف لپکے تھے اس تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ مگر جماعت کو پریشان تو کیا اسے اضطراب میں تو ڈالے رکھا۔

نجویٰ کی اس سازگار فضا میں جس میں تحریک کے علمبردارِ اولین کی ذات ہدف بنی چلی آ رہی تھی اور پے بہ پے اس کے خلاف ناوک اندازیاں ہو رہی تھیں، ناپاک سے ناپاک بہتان کے کسی طوفانِ عظیم کا اٹھا دینا ہرگز ناممکن نہ تھا، بشرطیکہ کوئی اچھا موقع قسمت سے فتنہ پردازوں کے ہاتھ آ جائے شیطان کو اس فضا سے فائدہ اٹھانے

اور منافقین کے گروہ کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کے لیے دوسری ضرورت ایک فعال کردار کی تھی جس کا ذہن شرارت اٹھانے کے لحاظ سے موجدانہ اور تخلیقی ہو اور جسے نجوی کے پیدا کردہ بارود کے ڈھیر میں لیجا لو کی طرح ایک چنگاری اٹھا پھینکنے کی عبارت حاصل ہو۔ سو اس طرح کا فعال کردار عبداللہ بن اُبیّ کی صورت میں پہلے ہی موجود تھا۔ اس شخص کے اندر اپنی شخصیت اور اہمیت کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ـــــ آخر ہجرت سے پہلے مدینہ کی بادشاہت کا تاج اُسی کے سر پر تو رکھے جانے کے لیے زیر تیاری تھا! لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس کی تمناؤں کے راستے میں روک بن گیا۔ بادشاہت تو دور رہی، اسے اپنے کردار کے سبب تحریک اسلامی کے دائرے میں آکر مرتبۂ اولیٰ تو کجا، مرتبہ ثانی و ثالث تک بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس حادثے نے اس کے ذہن میں بڑا تلخ اور زہریلا ردِّ عمل پیدا کر دیا اور یہ ردِّ عمل ہر آن ایک نہ ایک نئے فتنے کی شکل میں مدوجزر پیدا کرتا رہتا تھا۔ شیطان انسانوں میں براہِ راست تو بہت ہی تھوڑا کام کرتا ہے۔ اسے آلۂ کار کے طور پر شیاطین الانس کی ضرورت ہوتی ہے اور شیاطین الانس کو فی سبیل اللہ فساد میں متحرک رکھنے کے لیے وہ ان کے اوپر کوئی سرخیل چاہتا ہے۔ کوئی امامِ فتنہ! یہ امام فتنہ اسے مدینہ میں بنا بنایا ہاتھ آگیا۔ اور تھا بھی وہ تحریک اسلامی کے دائرے کے اندر! یہ ایک شخصیت' ایک پیغمبر کی قیادت میں چلنے والی تحریک پر بظاہر آمنا و صدقنا بھی کہہ چکی تھی اور دوسری طرف اسی پیغمبر کی ذات اور اس کے مشن کے ساتھ ہر پہلو سے بھڑ بھی رہی تھی۔

انانیت (SELF IMPORTANCE) کے زیر اثر اس فعال کردار نے بڑے تاریخی موقع پر اپنے جذبۂ حسد کے بھڑکتے آتش دان میں سے چنگاری اٹھا کر حرمِ نبوی میں ڈال دی اور آناً فاناً سارا معاشرہ ذہنی حیثیت سے بھڑ بھڑ جلنے لگا۔

(باقی آئندہ)

(بقیہ اشارات) منافرت ہے۔ یہ دلوں کو پھاڑ دینے والی، اور ساتھیوں کو آپس میں الجھا دینے والی چیز ہے۔ اس مرض میں جو لوگ مبتلا ہوں وہ عام معاشرتی زندگی کے لیے بھی موزوں نہیں ہو سکتے، کجا کہ کسی مقصدِ عظیم کی خدمت کے لیے موزوں قرار پا سکیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ صفت اُن صفات کے تو بالکل ہی برعکس ہے جو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی جدوجہد کے لیے مطلوب ہیں۔ وہ تنگ دلی کے بجائے فراخ دلی، بخل کے بجائے فیاضی، گرفت کے بجائے عفو و درگذر اور سخت گیری کے بجائے مراعات چاہتا ہے۔ اس کے لیے حلیم اور متحمل لوگ درکار ہیں۔ اُس کا بیڑا وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو بڑا ظرف رکھتے ہوں، جن کی سختی اپنے لیے اور نرمی دوسروں کے لیے ہو، جو خود کم سے کم الاؤنس چاہیں اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس دیں، جو اپنے عیوب اور دوسروں کی خوبیوں پر نگاہ رکھیں، جو تکلیف دینے کے بجائے تکلیف سہنے کے خوگر ہوں، اور چلتوں کو گرانے کے بجائے گرتوں کو تھامنے کا بل بوتا رکھتے ہوں۔ جو جماعت ایسے لوگوں پر مشتمل ہوگی وہ نہ صرف خود آپس میں مضبوطی کے ساتھ جڑی رہے گی بلکہ اپنے گرد و پیش کے معاشرے میں بھی بکھرے ہوئے اجزاء کو سمیٹتی اور اپنے ساتھ جوڑتی چلی جائیگی۔ اس کے برعکس تنگ دل اور کم ظرف لوگوں کا مجمع خود بھی بکھرے گا، اور باہر بھی جس جس سے اس کو سابقہ پیش آئے گا اسے نفرت دلا کر اپنے سے دور بھگا دے گا۔

معذرت

افسوس ہے کہ کاغذ کے متعلق حکومت کی پالیسی نے نیوز پرنٹ کی فراہمی میں شدید مشکلات پیدا کر دی ہیں، اور پچھلے چند مہینوں سے تو جگہ جگہ سے قرض پر کاغذ حاصل کرنے کی نوبت آ گئی ہے۔ اسی وجہ سے پچھلا پرچہ بھی ۶۴ صفحات پر شائع کیا گیا تھا اور یہ پرچہ بھی ۶۴ ہی صفحات پر جا رہا ہے۔ جب تک یہ مشکلات رفع نہ ہوں ناظرین کو صفحات کی یہ کمی برداشت کرنی ہوگی۔

خـــالی صفحـــه

Our English Literature

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study.
PP. 231-Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic way of thought and life, and our present social and political problems.
PP. 72-Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet.
PP. 64-Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56-Price As. 14

5. **Economic Problem of man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi
PP. 55-Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944
PP. 56-Price As. 12

7. **What is Islam?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi PP. 96-Price Re. 1/8

8. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazahr-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56-Price As. 12

9. **Maudoodi on Islamic Law and Constitution**—
Price Rs. 4/8

Can be had from

Markazi Maktaba-e-Jamat-e-Islami Pakistan
Ichhra LAHORE